فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	صبر اور صلوٰۃ کا مفہوم	نصرت محمود قریشی	8
قولِ نبیؐ	اسلام میں جھاڑ پھونک کی حیثیت	سید ابوالاعلیٰ مودودی	12
خاص مضمون	آن لائن میڈیا کے چیلنجز	ڈاکٹر گوہر مشتاق	16
نوائے شوق	نعت	نجمہ یاسمین یوسف	23
	غزل	کرامت بخاری	23
	تحفظ کا سائباں	شمیم فاطمہ	24
	غزل	فریدہ خانم	24
حقیقت وافسانہ	کسبِ کمال کُن	قانتہ رابعہ	25
	سودوزیاں	فرحی نعیم	28
	مہرباں کیسے کیسے	ام عمارہ	36
سلسلہ وار کہانی	مونالیزا	نصرت یوسف	39
مطالعہ گاہ	میری لائبریری سے	قانتہ رابعہ	46
انشائیہ	کس نام سے پکاروں	ربیعہ ندرت	51
ہلکا پھلکا	جاوید کی واپسی	ڈاکٹر سعدی مقصود	53
ملاقات	محترمہ سمیہ مسعود سے ایک ملاقات	آسیہ راشد	59
سیروسیاحت	کچھ بوسنیا کے بارے میں (۲)	صبیحہ نبوت	70
خفتگانِ خاک	کبھی ہیروں کو بھی مٹی میں ملا دیتے ہو	عالیہ حمید	73
محشرِخیال	زہرا نہالہ		76
غذا وصحت	دانت قدرت کا عطیہ ہیں	حکیم سید صابر علی	78
منتخب کالم	وہ ایک فرد نہیں استعارہ تھا	عرفان صدیقی	79

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! کیلنڈر پر ایک برس اور پیچھے سرک گیا۔ ایک ورق اور الٹا۔ حال، ماضی بن گیا اور مستقبل اپنے پوشیدہ خزانوں کے ساتھ اور قریب آ گیا۔ مہلت عمل کم ہوگئی اور زیاں کاری عمر بڑھ گئی۔ سود و زیاں کے کھاتے طویل تر ہو گئے۔ وقت...... جو نہ ماضی ہے نہ مستقبل......صرف لمحۂ موجود! یہ نام تو ہم نے اپنی آسانی کے لیے دے رکھے ہیں۔ جو لمحہ ہم نے کھو دیا وہ ماضی اور جو تلافی کا موقع دینے کے لئے پلٹ آیا وہ مستقبل۔ ورنہ اتنے بہت سے گزرے ہوئے سالوں کی حقیقت تو بس آخر میں یہی رہ جائے گی کہ عَشِيَّةً أَوْ ضُحٰهَا شام کا کچھ وقت یا صبح کا کچھ وقت!

اس جہانِ آب و گل میں خیر و شر کی کشمکش روز ازل سے جاری ہے اور ابد آباد تک جاری رہے گی۔ خیر کو تقویت دینے والے اپنا عمل رب کے ہاں درج کروا کر اس کا اجر محفوظ تو کر لیتے ہیں، مگر لوحِ جہاں پر بھی اپنا ان مٹ نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ جو قیامت تک اہلِ شر کے سینے پر مونگ دلتا رہتا ہے۔ دو قومی نظریے کا جان پر کھیل کر تحفظ کرنے والے، لا الہ کی بنیاد پر حاصل کیے ہوئے وطن کے جغرافیے کا بچاؤ کرنے والے، دشمن کی سازشوں کے آگے دیوار بن کر ڈٹ جانے والے پاکستان کے دوستوں پر بنگلہ دیش میں زندگی تنگ کر دی گئی ہے۔ عبد القادر ملا کو پاکستان کے تحفظ کے جرم پر بیالیس برس بعد عین سقوطِ ڈھاکہ کے دنوں میں تختہ دار پر کھینچ دیا گیا۔ دونوں ملکوں میں پاکستان کے دولخت ہونے پر پارہ پارہ ہونے والے دلوں نے خود کو ایک بار پھر اسی اذیت سے گزرتا محسوس کیا۔

ہوسِ اقتدار، ذاتی مفادات اور دشمن کی عیاری کی یہ مثلث اس وقت موجود محبّ وطن پاکستانیوں اور ان کی آئندہ نسلوں کے لیے ملکی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ رقم کر گئی۔ پھر مکتی باہنی کے انسانیت سوز مظالم کو مغربی پاکستان کے دوستوں کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ تحقیقاتی رپورٹیں دبا دی گئیں، شواہد پس پردہ ہو گئے اور اپنوں کی بدنیتی اور دشمنی کی ہوسِ انتقام کا یہ نتیجہ نکلا کہ آخر کار نصف صدی کے بعد انہی کو مجرم ٹھہرا دیا گیا جو خونِ دل دے کے چمن کی آبیاری کر رہے تھے۔

یہ جرمِ وفا کے بھاری، اقراری اور عادی مجرم تھے۔ اقبالؒ اور قائدؒ کے خواب کی اس زندہ تعبیر کے محافظ تھے۔ اسی لیے بیالیس برس بعد بھی دشمن کے سینے میں خنجر کی طرح پیوست تھے۔ خیر کے حصے میں فتح ہی فتح ہے مگر شر جیت کر بھی ہار جاتا ہے۔ عبد القادر کے لیے تو موت کا ایک دن معین تھا مگر سعادت کی زندگی کے بعد شہادت کی موت بھی ان کے نصیب میں لکھی تھی اور یہ کام اللہ کی ذات نے اہلِ شر کے ہاتھوں سے ہی لیا۔ اللہ اپنے اس بندے کی بہترین میزبانی فرمائے اور اس شہادت کو اہلِ خیر کی تقویت کا باعث بنائے آمین۔

سقوطِ ڈھاکہ پر بھارتی مصنفہ شرمیلا بوس کی کتاب ان ناقابلِ تردید حقائق کو کھول کر سامنے لے آئی ہے جنہیں بھارت کے

مسلسل پراپیگنڈے نے ہمیشہ مسخ کرکے پیش کیا۔اور ہمارے اوپر مسلط سیاست وحکومت اورفوج کے (اوراب میڈیا کے بھی) مفاد پرست ٹولے نے پورے گٹھ جوڑ کے ساتھ عوام کے سامنے لانے سے روکے رکھا۔اس تحقیق کے مطابق مشرقی پاکستان کو الگ کرنے میں بھارت کا واضح مفاد شامل تھااور پاکستانی فوج کے ''مظالم'' کوحقیقتِ حال سے بہت مختلف اور بڑھاچڑھا کر پیش کیا جاتا رہا۔جھوٹ کے سر پر کتنی ہی طاقتوں کا ہاتھ کیوں نہ ہو، سچ کی ایک کرن جھوٹ کا پردہ چاک کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔یہ بندوبست خالقِ کائنات کی طرف سے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔امتحان تو انسان کا ہے کہ وہ اپنا وزن کس پلڑے میں ڈالتا ہے۔بہت سوں کوکلمہ گو ہوکربھی سچ کہنے کی تو کیا، سچ کا ساتھ دینے کی بھی توفیق نہیں ملتی اور کئی غیرمسلم بھی اپنی فطرت کی پکار پرخیر کو تقویت دینے کا باعث بن جاتے ہیں۔

پاکستان میں عراق کی طرز پرفرقہ وارانہ فسادات کو ہوادی جاری ہے۔یہ صورتحال بے حد تکلیف دہ ہے۔ایسا صرف اس لیے ہورہاہے کہ ایک سانحے کے بعد غیر جانبدارانہ تحقیقات نہیں کرائی جاتیں۔مجرموں کوسزائیں نہیں ملتیں اور مجرموں کی شناخت پر پردے ڈالے جاتے ہیں۔پاکستان میں خانہ جنگی برپا کرنا ہمارے خطے میں عالمی طاقتوں کے مفادات کو بڑھاوادینے کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ہمارے ارباب اختیار اگر ملک وقوم کے ساتھ مخلص ہیں توانہیں اللہ سے ڈرتے ہوئے اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری ادا کرنی چاہیےاور مجرموں کوکسی رورعایت کے بغیر انصاف کے کٹہرے میں لانا چاہیے۔

مختلف فرقوں کے پیروکاروں کوبھی سوچنا چاہیے کہ دین ہمیں جوڑنے کا باعث ہے نہ کہ توڑنے کا۔اختلافات ہر جگہ ہوسکتے ہیں مگر دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا بھی دین کا ایک اہم جز ہے۔ہمارے قول وفعل سے کوئی ایسی بات سرزد نہیں ہونی چاہیے جو کسی کی کم علمی اور کم فہمی کے ہتھے چڑھ کرفساد کا باعث بنے یا کسی کی بدنیتی اس سے کوئی فائدہ اٹھاسکے۔

ہمارے ہاں ربیع الاول کا مہینہ نبی اکرم رحمت اللعالمینؐ کے اسوہ حسنہ کی تذکیر اوراُنؐ سے اظہار محبت سے بھرپور گزرتا ہے۔ نبی امی ﷺ کے نامِ مبارک پر برپا کی گئی محفلوں میں آپؐ کی سیرت وکردار کے مختلف گوشوں کا تذکرہ ہمیں اپنی زندگیوں کے جائزے کا موقع دیتا ہے۔آپؐ کے فرمان کے مطابق مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں کہ ایک حصے کوتکلیف پہنچے تو دوسرا بھی اس درد میں شریک ہو۔ہم اپنے اعمال کے مطابق آپؐ سےنسبت کے حقدار تونہیں مگر اللہ سے دعا گو ہیں کہ ہمیں اُنؐ کی حیاتِ پاک کی کوئی رمق ہی عطا کردے تو ہمارے حالات سنور جائیں اور مصائب میں کمی آجائے۔

دعاؤں میں یاد رکھیے

صائمہ اسما

☆☆☆☆☆

صبر اور صلوٰۃ کا مفہوم

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (البقرہ ۲:۱۵۳)

''اے لوگو! جو (اس بات کا دعویٰ رکھتے ہو) کہ تم مومن ہو تو پھر (بوقت ضرورت) صبر کر کے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ نماز کے ذریعے اپنا تعلق جوڑ کر اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کیا کرو اور اس بات کا یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی معیت (ساتھ) انھیں نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جسے مخاطب کیا ہے وہ مومن ہے صرف مسلمان نہیں۔ یعنی یہ نہیں فرمایا اے مسلمانو! بلکہ فرمایا اے ایمان کے دعویدارو! گویا مومن اور مسلمان میں فرق ہے۔ ہر مومن تو لازماً مسلم ہوتا ہے مگر ہر مسلمان لازماً مومن نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان اور اسلام کا فرق اس طرح واضح فرمایا ہے۔

''یہ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ انھیں کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہ ہم اسلام لے آئے ہیں ...... ایمان تو ابھی تمھارے دلوں میں داخل ہوا ہی نہیں۔'' (۴۹:۱۴)

حدیث جبرئیل سے تو سبھی واقف ہوں گے جس میں اسلام، ایمان اور قیامت کا ذکر ہے۔ اس کے مطابق پہلا درجہ اسلام ہے، پھر ایمان اور ایمان کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ گویا جس نے لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیا وہ قانونی طور پر تو مسلمان ہو گیا، اب اصل میں تو اسے یہ اقرار کر لینا چاہیے کہ اس کی اپنی خواہشات کی اب کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اسے اپنی مرضی اللہ تعالیٰ کی رضا کے سامنے جھکا دینی چاہیے لیکن کیونکہ ایمان اس کے دل میں داخل ہوا ہی نہیں ہوتا، اس نے پورے انشراحِ صدر (کھلے دل و دماغ) کے ساتھ اس بات کو قبول نہیں کیا ہوتا اس لیے وہ کہیں کہیں ڈنڈی مار جاتا ہے۔ مثلاً خوشی کی تقریبات میں بے تحاشا نمود و نمائش اور اسراف سے کام لینا جس میں میرے اللہ کی مرضی ہرگز شامل نہیں لیکن میرے دل کا چور اور سوسائٹی کا پریشر مجھے اپنی مرضی کرنے پر آمادہ کرے

گا۔ مجھے بالکل یاد نہیں رہے گا کہ نبی کریمؐ نے فرمایا ہوا ہے کہ شادی وہی بہترین ہے جس میں کم سے کم اخراجات ہوں۔ مہندی پر تو ویسے جتنی رقم خرچ ہو ہی جاتی ہے، یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ہمیں 'مبذّرین' (فضول خرچ) نہیں بننا چاہیے کیونکہ 'مبذّرین شیطان کے بھائی ہیں' (۱۷:۲۷) اور سورۂ مومنون میں مومن بندوں کی صفات میں سے ایک 'عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ' ۔ یعنی مومن اس قسم کی خرافات سے دور رہتے ہیں۔

لوگوں کی ایک اور قسم قرآن میں بتائی گئی ہے۔ ''لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو ایمان کے کنارے (بارڈر لائن) پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبدیت اختیار کرتا ہے۔ اگر اسے سب اچھا اچھا ملتا رہے تو وہ مطمئن! اور اگر کوئی آزمائش آ پڑے تو فوراً (اللہ کی عبدیت) سے منہ موڑ بیٹھے۔'' (۲۲:۱۱)

تیسری قسم میں اللہ کا ایک بندہ ہے جو دل کی آنکھیں کھول کر یعنی 'عَلٰی بَصِیْرَۃٍ' ۱۲:۱۰۸) اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے۔ ایسا کرنے میں اسے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ جس اللہ کی بات وہ مان رہا ہے اُسی نے اس کو بنایا ہے اور وہ اسے اندر باہر سے اُس سے کہیں بہتر طریقے سے جانتا ہے جتنا وہ اپنے آپ کو جانتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا خیرخواہ بھی سمجھتا ہے اور 'عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر' پر بھی اس کا ایمان ہے۔ اس ایمان کے نتیجے میں وہ عافیت محسوس کرتا ہے۔ اس کے دل سے ہر طرح کا خوف اور ڈر دور ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو ایک پر امن حصار میں سمجھتا ہے۔ بس یہی وہ کیفیت ہوتی ہے جسے ایمان کہتے ہیں اور جس کے بل بوتے پر انسان کے دل سے ما سوا اللہ ہر قسم کا خوف دور ہو جاتا ہے اور وہ ابراہیمؑ کی طرح آگ میں بے خطر کود جاتا ہے یا فرعون کے جادوگروں کی طرح وہ ہر خوف اور دھمکی سے بھڑ جاتا ہے۔ یا بلالؓ کی طرح اس کو مکہ کی گرم ریت اور سینے پر بھاری پتھر پر کاہ کی طرح لگتا ہے اور ہم جیسے کمزور انسان تو بہت بڑا تیر ماریں تو سوسائٹی کے دباؤ کو برداشت کر کے لغویات سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

بہرحال ایمان کا مطلب اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اگر ہم سمجھتے ہیں کہ ہم صاحب ایمان ہیں، تو سب سے پہلے ہمارا ایمان اور یقین یہ ہونا چاہیے کہ یہ زندگی، اس میں پیش آنے والے واقعات اچھے یا

برے، یا اتنے برے کہ ہم انھیں مصائب سمجھتے ہوں، سب کے سب اللہ تعالیٰ کے گرینڈ پلان کا حصہ ہیں۔اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ''جس بھی واقعے (اچھے یا برے) سے تمھیں پالا پڑتا ہے۔خواہ وہ زمین سے متعلق ہو یا تمھاری اپنی جانوں سے متعلق! قبل اس کے کہ ہم اسے وقوع پذیر کریں وہ ایک لکھی ہوئی کتاب (طے شدہ) کی شکل میں موجود ہے۔اور یہ کام (اس کی کتابت اور اس کا وقوع پذیر ہونا) اللہ تعالیٰ کے لیے بہت آسان ہے۔'' (۲۲:۵۷)

جیسے حکومت ایک ڈیم بناتی ہے تو سب سے پہلے اسے پلان کرتی ہے۔ پھر اسے دستاویز کی شکل دیتی ہے۔ پھر کوئی گاؤں یا بستی ڈیم کی جھیل کے نیچے آ کر ڈوب جائے گا اور کچھ گاؤں ڈیم کے پانی سے سیراب ہوں گے اور ان میں فصلیں لہلہائیں گی تو جن کے گاؤں ڈوب جائیں گے جب وہ شور مچائیں گے تو حکومت کہہ دے گی کہ یہ سب کچھ تو پہلے سے طے شدہ تھا۔ایک معمولی ڈیم کے لیے تو یہ سب کچھ حکومت کر سکتی ہے اور اسے کوئی پوچھ نہیں سکتا۔تو کیا اتنی بڑی کائنات اور اتنا بڑا 'احکم الحاکمین' یہ سب نہیں کر سکتا! ڈیم بنانے والی حکومت تو آپ کی ڈوبی ہوئی زمینوں کے لیے آپ کو متبادل زمین کا وعدہ کرے گی یا معاوضے کا وعدہ کرے گی۔کبھی وہ وعدہ پورا کرے گی اور کبھی نہیں۔لیکن اس علیم وخبیر منصوبہ ساز کے منصوبے کی وجہ سے کسی انسان کو تکلیف پہنچے گی تو اس کے لیے یہ تسلی کافی ہونی چاہیے کہ اُس دوچند سہ چند بلکہ سات سو گنا تک اجر دینے والے کے پاس معاوضے کی کوئی کمی نہیں۔

اپنے کورس کی کتابوں میں میں نے ایک حدیث قدسی پڑھی تھی کوشش بسیار کے باوجود میں اس کا حوالہ حاصل نہیں کر سکی۔لیکن میں اس کا مفہوم آپ کے ساتھ ضرور شیئر کرنا چاہتی ہوں اور وہ یہ ہے کہ ایک بندہ جب بے شمار انعام واکرام اپنے لیے دیکھے گا تو وہ کہے گا کہ اللہ تعالیٰ میں نے تو اتنا اچھا کوئی کام نہیں کیا تھا پھر یہ کس چیز کا اجر ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب یہ ہوگا کہ فلاں تکلیف جو بغیر اس بات کے کہ وہ تیرے کسی عمل کے نتیجے میں ہو تجھے پہنچی تھی (میرے گرینڈ پلان کے مطابق) یہ اس کی Compensation ہے۔تو بندہ کہے گا، مجھے خبر ہوتی کہ اتنی چھوٹی تکلیف کی اتنی بڑی جزا مجھے ملے گی تو بھلے

دنیا میں میری کھال قینچی سے کاٹ دی جاتی۔

دوسری بات ہمیں یہ سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''ہم نے انسان کو محنت، شفقت اور شدائد والی زندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔'' (۹۰:۴) اگر ہم اس کے برعکس یہ سمجھتے رہیں گے کہ یہ زندگی پھولوں کی سیج ہے تو ہم غلطی پر ہیں۔

تیسری صورت میں یہ حالات واقعات یا مصائب ہمیں آزمائش کے طور پر پیش آ سکتے ہیں۔ ''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ان کے اس دعوے کے بعد کہ ہم ایمان لے آئے ہیں انھیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا اور انھیں آزمایا نہیں جائے گا۔'' (۲:۲۹) ''ہم تمھیں ضرور آزمائیں گے۔ خوف اور بھوک (قحط) سے، اموال اور جانوں کے نقصان اور ثمرات (ends results) کے نقصان سے۔'' (۲:۱۵۵)

مندرجہ بالا آیات کو پڑھ سن اور سمجھ کر تو زندگی کا نقشہ بڑا ہی خوفناک ہے۔ لیکن اگر ہم ان آیات پر ایمان رکھیں تو ہمیں بہت آسانی ہو جائے کہ ''ہم اللہ ہی کے ہیں یعنی (اللہ تعالیٰ) کے ہی کسی نہ کسی منصوبے کے لیے (بنائے گئے ہیں) اور ہم نے واپس بھی اُسی کے پاس جانا ہے۔'' (۲:۱۵۶)

دوسری بات کہ ہمارا یہ ایمان ہونا چاہیے کہ ''اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔'' (۲:۲۸۶) مان لیں کہ وہ علیم و خبیر جانتا ہے کہ اس کا بندہ کتنا بوجھ سہہ سکتا ہے۔ ایک آرکیٹکٹ تو اتنا عقلمند ہوتا ہے کہ وہ عمارت بناتے وقت اس کی دیواروں یا ستونوں پر ان کی Specification سے زیادہ بوجھ نہ ڈالے اور وہ ''خلاق العلیم'' اتنا بے خبر ہے کہ وہ اپنے بندے پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈال دے؟ ہرگز نہیں! ساتھ ساتھ اس رحمٰن و رحیم نے ہمیں بہت پیاری دعا بھی سکھائی ہے۔

''اے ہمارے رب ہم پر اتنا بوجھ نہ ڈالیے جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔'' (۲:۲۸۶) جب ہم ان الفاظِ ربانی پر ایمان رکھتے ہوئے دعا کریں گے تو ہمارے اندر اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہر آزمائش کے لیے یقیناً طاقت پیدا ہو گی اور یقین رکھیں اللہ تعالیٰ آپ کو صرف آزمائشوں میں ڈال ہی نہیں رہا بلکہ وہ آپ کو ان سے نکلنے کا طریقہ بھی بتا رہا ہے۔ وہ کیسے؟ وہ ایسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''مدد طلب کرو صبر کر کے اور (میرے ساتھ تعلق جوڑ کے) نماز کے ساتھ۔'' (البقرہ)

یہ صبر کیا ہوتا ہے؟ صبر کا لغوی مطلب ہے

''روکنا، اپنے آپ کو قابو میں رکھنا، برداشت کرنا، ہمت سے کام لینا، ثابت قدم رہنا، ڈٹ جانا اور سب سے بڑھ کر اپنے نفس امارہ کو مقید کر دینا محبوس کر دینا۔'' کیونکہ نفس امارہ تو موقعے کی تلاش میں رہتا ہے کہ کون سا کمزور لمحہ ہو اور وہ آپ پر حملہ کر دے۔ ''کیوں بھئی تم ہی رہ گئے ہو ایسی آزمائشوں کے لیے؟ اتنی دیر ہو گئی ہے۔ اب بس بھی کر دے اللہ تعالیٰ آزمانا!''

یا اس عورت کی طرح جو قبر کے سرہانے بیٹھ کر واویلا کر رہی تھی اور جسے نبی کریمؐ نے صبر کی تلقین کی تو بولی، ''جو مصیبت مجھے پہنچی ہے تجھے نہیں پہنچی۔'' (اس لیے صبر پر لیکچر دینا آسان ہے) خدانخواستہ ہم بھی یہ رویہ رکھیں کہ شاید میرے ساتھ ہی اس دنیا میں یہ سب ہو رہا ہے اور نبی کریمؐ کی اس بات کو بھول جائیں کہ اپنے سے کمتر کی طرف دیکھو گے تو تمھیں صبر آ جائے گا۔ اور وہ آیت بھی بھول جائیں کہ ''اس چیز کی تمنا ہرگز نہ کرو جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض سے کچھ زیادہ دے رکھا ہے۔'' (۳۲:۴) کہ فلاں کو تو اللہ تعالیٰ نے دو دو بیٹوں سے نوازا ہے اور مجھے ایک دے کر وہ بھی واپس لے لیا ہے۔ اب بے چارہ انسان جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ''انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔'' (۲۸:۴) جب اس کو کسی نقصان کی شدید چوٹ لگتی ہے تو وہ بلبلا اٹھتا ہے، نہایت دکھی ہو جاتا ہے۔ حزن و ملال سے بھر جاتا ہے اور بعض اوقات مایوس بھی ہو جاتا ہے۔ اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہا ہوتا ہے۔ اس کے لیے اپنی پوری جزئیات کے ساتھ والا صبر کرنا تو ممکن نہیں ہوتا ایسی کیفیت کے لیے بھی رحمۃ اللعالمینؐ نے فرمایا ہے۔ ''وَمَنْ يَتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللّٰهُ'' کہ جو اوپر اوپر سے ہی صبر کرے پورے دل کے ساتھ صبر نہ کر رہا ہو بلکہ صرف صبر کرنے کو Pretend ہی کر رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے پورا پورا صبر کرنے کی توفیق دے دیتا ہے۔ گویا جب آپ صبر سے مدد لینے کی کوشش ہی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے نفس امارہ کو مقید کرنے کی، آپ کو زندگی کی جہد و جہد میں ڈٹ جانے کی توفیق دے دیتا ہے۔ آپ کے قدم جما دیتا ہے اور آپ کو نبی کریمؐ کے اس قول کے مطابق بننے میں مدد دیتا ہے کہ ''مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے جب اسے مصیبت پہنچے تو بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور اگر راحت پہنچے تو بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہے''،

کیونکہ اس نے اس بات کو بہت اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ''دنیا میں پیش آنے والے تمام واقعات کتاب میں لکھے جا چکے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تمھیں بتا اس لیے رہے ہیں تا کہ اگر کوئی چیز تم سے گم، ضائع یا فوت ہو جائے تو اس پر تاسف نہ کرو......اور اگر تمھیں کوئی چیز (بہتر) اللہ تعالیٰ دے دے اس پر فخر نہ کرو۔'' (۲۳:۵۷)

اور صبر تو ہوتا ہی عَلٰی طَاعَةِ الْجَبَّارِ۔ یہ جو آپ کا، میرا رحمٰن و رحیم اللہ الجبار بن جاتا ہے تو بھی میرے اور آپ کے فائدے کے لیے بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''جو بھلائی تجھے پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو سیئہ تجھے پہنچتی ہے وہ تیری اپنی طرف سے ہے۔'' (۷۹:۴) یعنی تیرے اپنے ہی اعمال کے نتیجے میں ہے۔ جب اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ہمارے حالات ناگفتہ بہ ہو جاتے ہیں، بکھر جاتے ہیں، ہمارے قابو سے باہر ہو جاتے ہیں تو 'الجبار' ان ریزہ ریزہ بکھرے ہوئے حالات کو جوڑتا ہے تو ہم اسی طرح چیخ اٹھتے ہیں جیسے ہڈی جوڑنے والے کے ہڈی کو جگہ پر بٹھانے کے عمل کے دوران چیختے ہیں۔ مت بھولیں کہ جب ہڈی جوڑنے والا آپ کی ہڈی کو جوڑ دیتا ہے تو آپ کو کتنا سکون ملتا ہے۔

دوسری چیز جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں مدد لینے کے لیے کہا ہے وہ 'اَلصَّلٰوة' ہے۔ الصلوٰۃ کو بھی ہم اگر صرف نماز کے معنی میں ہی نہ لیں بلکہ اس کے وسیع تر معانی میں لیں تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ صلوٰۃ کا ایک ضروری پہلو چمٹنا اور جڑنا بھی تو ہے۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ صلوٰۃ کے دوسرے مطالب مثلاً استغفار، قیام، رکوع، سجود اور دعا وغیرہ اللہ تعالیٰ سے جڑنے کے ذرائع ہیں۔ نبی کریمؐ کو جب کوئی مشکل پیش آتی تو فوراً نوافل ادا کرنے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جیسے بچے کو چوٹ لگے تو فوراً ماں کی طرف بھاگتا ہے کیونکہ اسے ماں کی گود سے زیادہ بڑی پناہ گاہ کا کوئی تصور نہیں۔

جو انسان چوٹ لگتے ہی اللہ تعالیٰ سے جڑنے اور چمٹنے کا قصد کر لیتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق صلوٰۃ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اعانت طلب کرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو یقین دلا رہا ہے کہ ''یقین رکھو جو صبر کرتے ہیں تو ان کو اللہ تعالیٰ کا ساتھ نصیب ہوتا ہے۔''

ایک عورت کا خاوند اچانک فوت ہو جاتا ہے اور اس کا بھائی یا باپ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے کہ بہن یا بیٹی فکر نہ کرو ہم تمھارے ساتھ ہیں، تو اسے فوری تسکین ملتی ہے۔ یہ تو آپ کو پیدا کرنے والا، آپ کی ضروریات کا خیال رکھنے والا، آپ کو رزق بہم پہنچانے والا، فائدہ مند چیزیں بہم پہنچانے والا، ضرر رساں چیزوں سے بچانے والا، آپ کو پالنے پنپنے کے تمام ذرائع مہیا کرنے والا آپ کا رب آپ کا اللہ تعالیٰ آپ سے کہہ رہا ہے کہ ''مشکل اوقات میں صبر کر کے اور میرے ساتھ جڑنے چمٹنے کا چارہ کر کے مجھ سے مدد طلب کیا کرو۔ یقیناً مجھے تم صبر کرنے والوں کے ساتھ پاؤ گے۔''

تو جس کی مدد کی یقین دہانی اللہ کروا دے اسے کسی اور ساتھ یا سہارے کی کیا ضرورت!!!

☆......☆......☆

اسلام میں جھاڑ پھونک کی حیثیت

اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ آیا جھاڑ پھونک کی اسلام میں کوئی گنجائش ہے؟ اور یہ جھاڑ پھونک بجائے خود موثر بھی ہے یا نہیں؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ بکثرت صحیح احادیث میں یہ ذکر آیا ہے کہ رسولؐ ہر رات کو سوتے وقت اور خاص طور پر بیماری کی حالت میں معوّذتین یا بعض روایات کے مطابق معوّذات (یعنی قل ہو اللہ اور معوّذتین) تین مرتبہ پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پھونکتے اور سر سے پاؤں تک پورے جسم پر، جہاں جہاں تک بھی آپ کے ہاتھ پہنچ سکتے، انہیں پھیرتے تھے۔ آخری بیماری میں جب آپؐ کے لیے خود ایسا کرنا ممکن نہ رہا تو حضرت عائشہؓ نے یہ سورتیں (بطور خود یا حضورؐ کے حکم سے) پڑھیں اور آپؐ کے دست مبارک کی برکت کے خیال سے آپؐ ہی کے ہاتھ لے کر آپؐ ہی کے جسم پر پھیرے۔ اسی مضمون کی روایات صحیح سندوں کے ساتھ بخاری، مسلم، نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد اور موطا امام مالک میں خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں جن سے بڑھ کر کوئی بھی حضورؐ کی خانگی زندگی سے واقف نہ ہو سکتا تھا۔

اس معاملہ میں پہلے مسئلہ شرعی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ احادیث میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طویل روایت آئی ہے جس کے آخر میں حضورؐ فرماتے ہیں کہ میری امت کے وہ لوگ بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے جو نہ داغنے کا علاج کراتے ہیں، نہ جھاڑ پھونک کراتے ہیں، نہ فال لیتے ہیں بلکہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں (مسلم) حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جس نے داغنے سے علاج کرایا اور جھاڑ پھونک کرائی وہ اللہ پر توکل سے بے تعلق ہو گیا۔ (ترمذی) حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول کریمؐ دس چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے جن میں سے ایک جھاڑ پھونک بھی ہے سوائے معوذتین یا معوذات کے (ابوداؤد، احمد، نسائی، ابن حبان، حاکم) بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں حضورؐ نے جھاڑ پھونک سے بالکل منع فرما دیا تھا ،لیکن بعد میں اس شرط کے ساتھ اس کی اجازت دے

دی کہ اس میں شرک نہ ہو، اللہ کے پاک ناموں یا اس کے کلام سے جھاڑا جائے، کلام ایسا ہو جو سمجھ میں آئے اور یہ معلوم کیا جا سکے کہ اس میں کوئی گناہ کی چیز نہیں ہے اور بھروسہ جھاڑ پھونک پر نہ کیا جائے کہ وہ بجائے خود شفا دینے والی ہے، بلکہ اللہ پر اعتماد کیا جائے کہ وہ چاہے گا تو اسے نافع بنا دے گا۔ یہ مسئلہ شرعی واضح ہو جانے کے بعد اب دیکھیے کہ احادیث اس بارے میں کیا کہتی ہیں:

طبرانی نے صغیر میں حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ کو ایک دفعہ نماز کی حالت میں بچھو نے کاٹ لیا۔ جب آپؐ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا بچھو پر خدا کی لعنت، یہ نہ کسی نمازی کو چھوڑتا ہے نہ کسی اور کو۔ پھر پانی اور نمک منگوایا اور جہاں بچھو نے کاٹا تھا وہاں آپؐ نمکین پانی ملتے جاتے اور قل یا ایہا الکافرون، قل ھو اللہ احد، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھتے جاتے تھے۔

ابن عباس کی یہ روایت بھی احادیث میں آئی ہے کہ نبیؐ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ پر یہ دعا پڑھتے تھے۔ اُعِیْذُ کُمَا بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّآمَّۃِ مِنْ کُلِّ شَیْطَانٍ وَّھَامَّۃٍ وَّمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَّآمَّۃٍ "میں تم کو اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ میں دیتا ہوں ہر شیطان اور موذی سے اور نظر بد سے۔" (بخاری، مسند احمد، ترمذی اور ابن ماجہ)

عثمان بن ابی العاص الثقفی کے متعلق مسلم، موطا، طبرانی اور حاکم میں تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ یہ روایت آئی ہے کہ انہوں نے رسول اللہؐ سے شکایت کی کہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں مجھے ایک درد محسوس ہوتا ہے جو مجھ کو مارے ڈالتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا اپنا سیدھا ہاتھ اس جگہ پر رکھو جہاں درد ہوتا ہے۔ پھر تین مرتبہ بسم اللہ کہو اور سات مرتبہ یہ کہتے ہوئے ہاتھ پھیرو کہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ وَ قُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّمَآ اَجِدُ وَ اُحَاذِرُ "میں اللہ اور اس کی قدرت کی پناہ مانگتا ہوں اُس چیز کے شر سے جس کو میں محسوس کرتا ہوں اور جس کے لاحق ہونے کا مجھے خوف ہے۔" موطا میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ عثمانؓ بن ابی العاص نے کہا کہ اس کے بعد میرا وہ درد جاتا رہا، اور اسی چیز کی تعلیم میں اپنے گھر والوں کو دیتا ہوں۔

مسند احمد اور طحاوی میں طلقؓ بن علی کی روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بچھو نے کاٹ لیا۔ حضورؐ نے مجھ پر پڑھ کر پھونکا اور

اس جگہ پر ہاتھ پھیرا۔

مسلم میں ابوسعیدؓ خدری کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو جبریل نے آ کر پوچھا ''اے محمدؐ، کیا آپ بیمار ہو گئے؟'' آپ نے فرمایا ہاں۔ انھوں نے کہا بِاسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيْكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ اَوْعَيْنٍ حَاسِدٍ، اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ بِاسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ اللہ کے نام پر آپ کو جھاڑتا ہوں ہر اُس چیز سے جو آپ کو اذیت دے اور ہر نفس اور حاسد کی نظر کے شر سے، اللہ آپ کو شفا دے، میں اُس کے نام پر آپ کو جھاڑتا ہوں۔'' اسی سے ملتی جلتی روایت مسند احمد میں حضرت عبادہ بن صامت سے منقول ہے کہ حضورؐ بیمار تھے۔ میں عیادت کے لیے گیا تو آپ کو سخت تکلیف میں پایا۔ شام کو گیا تو آپ بالکل تندرست تھے۔ میں نے اس قدر جلدی تندرست ہو جانے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ جبریل آئے تھے اور انھوں نے مجھے چند کلمات سے جھاڑا۔ پھر آپ نے قریب قریب اُسی طرح کے الفاظ اُن کو سنائے جو اوپر والی حدیث میں نقل کیے گئے ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے بھی مسلم اور مسند احمد میں ایسی ہی روایت نقل کی گئی ہے۔

امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت حفصہؓ ام المومنین کی روایت نقل کی ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں آئے اور میرے پاس ایک خاتون شفاؓ بنت عبداللہ نامی بیٹھی تھیں جو نملہ (ذباب) کو جھاڑا کرتی تھیں۔ حضورؐ نے فرمایا حفصہؓ کو بھی وہ عمل سکھا دو۔ شفاؓ بنت عبداللہ کی یہ روایت امام احمد، ابوداؤد اور نسائی نے نقل کی ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا کہ تم نے حفصہؓ کو جس طرح لکھنا پڑھنا سکھایا ہے نملہ کا جھاڑنا بھی سکھا دو۔

مسلم میں عوفؓ بن مالک اشجعی کی روایت ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں ہم لوگ جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اس معاملہ میں حضورؐ کی رائے کیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا جن چیزوں سے تم جھاڑتے تھے وہ میرے سامنے پیش کرو، جھاڑنے میں مضائقہ نہیں ہے جب تک اُس میں شرک نہ ہو۔

مسلم، مسند احمد اور ابن ماجہ میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک سے روک دیا تھا۔ پھر حضرت عمرو بن حزم کے خاندان کے لوگ آئے اور کہا کہ ہمارے

پاس ایک عمل تھا جس سے ہم بچھو (یا سانپ) کے کاٹے کو جھاڑتے تھے۔مگر آپ نے اس کام سے منع فرما دیا ہے۔ پھر انھوں نے وہ چیز آپ کو سنائی جو وہ پڑھتے تھے۔آپ نے فرمایا ''اِس میں تو کوئی مضائقہ میں نہیں پاتا،تم میں سے جو شخص اپنے کسی بھائی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے وہ ضرور پہنچائے''۔ جابرؓ بن عبداللہ کی دوسری حدیث مسلم میں یہ ہے کہ آلِ حزم کے پاس سانپ کاٹے کا عمل تھا اور حضوؐر نے ان کو اس کی اجازت دے دی۔اس کی تائید مسلم،مسند احمد اور ابن ماجہ میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت بھی کرتی ہے کہ حضوؐر نے انصار کے ایک خاندان کو ہر زہریلے جانور کے کاٹے کو جھاڑنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ مسند احمد اور ترمذی اور مسلم اور ابن ماجہ میں حضرت انس سے بھی اس سے ملتی جلتی روایات نقل کی گئی ہیں جن میں حضوؐر نے زہریلے جانوروں کے کاٹے،اور ذباب کے مرض اور نظر بد کے جھاڑنے کی اجازت دی۔

مسند احمد،ترمذی،ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت عمیرؓ مولیٰ اَبی اللّحَم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں میرے پاس ایک عمل تھا جس سے میں جھاڑا کرتا تھا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے پیش کیا۔آپؐ نے فرمایا فلاں فلاں چیزیں اس میں سے نکال دو، باقی سے تم جھاڑ سکتے ہو۔

موطا میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی صاحبزادی حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ بیمار ہیں اور ایک یہود یہ اُن کو جھاڑ رہی ہے۔اس پر انھوں نے فرمایا کہ کتاب اللہ پڑھ کر جھاڑ۔اس سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب اگر تورات یا انجیل کی آیات پڑھ کر جھاڑیں تب بھی یہ جائز ہے۔

رہا یہ سوال کہ آیا جھاڑ پھونک مفید بھی ہے یا نہیں،تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوا اور علاج سے نہ صرف یہ کہ کبھی منع نہیں فرمایا، بلکہ خود فرمایا کہ ہر مرض کی دوا اللہ نے پیدا کی ہے اور تم لوگ دوا کیا کرو۔حضوؐر نے خود لوگوں کو بعض امراض کے علاج بتائے ہیں، جیسا کہ احادیث میں کتاب الطب کو دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔لیکن دوا بھی اللہ ہی کے حکم اور اذن سے نافع ہوتی ہے، ورنہ اگر دوا اور طبی معالجہ ہر حال میں نافع ہوتا تو ہسپتالوں میں کوئی نہ مرتا۔ اب اگر دوا اور علاج

کرنے کے ساتھ اللہ کے کلام اور اس کے اسمائے حسنٰی سے بھی استفادہ کیا جائے، یا ایسی جگہ جہاں کوئی طبی امداد میسر نہ ہو اللہ ہی کی طرف رجوع کر کے اس کے کلام اور اسماء وصفات سے استعانت کی جائے تو یہ مادہ پرستوں کے سوا کسی کی عقل کے بھی خلاف نہیں ہے۔ البتہ یہ صحیح نہیں ہے کہ دوا اور علاج کو، جہاں وہ میسر ہو، جان بوجھ کر چھوڑ دیا جائے اور صرف جھاڑ پھونک سے کام لینے ہی پر اکتفا کیا جائے اور کچھ لوگ عملیات اور تعویذوں کے مطب کھول کر بیٹھ جائیں اور اسی کو کمائی کا ذریعہ بنالیں۔

اس معاملہ میں بہت سے لوگ حضرت ابوسعید خدریؓ کی اُس روایت سے استدلال کرتے ہیں جو بخاری، مسلم، ترمذی، مسند احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ میں منقول ہوئی ہے اور اس کی تائید بخاری میں ابن عباسؓ کی بھی ایک روایت کرتی ہے۔ اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضوؐر نے ایک مہم پر اپنے چند اصحاب کو بھیجا جن میں حضرت ابوسعیدؓ خدری بھی تھے۔ یہ حضرات راستہ میں عرب کے ایک قبیلے کی بستی پر جا کر ٹھہرے اور انھوں نے قبیلے والوں سے کہا کہ ہماری میزبانی کرو۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ اتنے میں قبیلے کے سردار کو بچھو نے کاٹ لیا اور وہ لوگ ان مسافروں کے پاس آئے اور کہا کہ تمھارے پاس کوئی دوا یا عمل ہے جس سے تم ہمارے سردار کا علاج کر دو؟ حضرت ابوسعیدؓ نے کہا ہے تو سہی، مگر چونکہ تم نے ہماری میزبانی سے انکار کیا ہے اس لیے جب تک تم کچھ دینا نہ کرو، ہم اس کا علاج نہیں کریں گے۔ انھوں نے بکریوں کا ایک ریوڑ (بعض روایات میں ہے ۳۰ بکریاں) دینے کا وعدہ کیا اور حضرت ابوسعیدؓ نے جا کر اس پر سورۂ فاتحہ پڑھنی شروع کی اور لعاب دہن اس پر ملتے گئے۔ آخر کار بچھو کا اثر زائل ہو گیا اور قبیلے والوں نے جتنی بکریاں دینے کا وعدہ کیا تھا وہ لا کر دے دیں۔ مگر ان حضرات نے آپس میں کہا ان بکریوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھاؤ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ نہ لیا جائے۔ نہ معلوم اس کام پر اجر لینا جائز ہے یا نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ حضوؐر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا عرض کیا۔ حضوؐر نے ہنس کر فرمایا ''تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ سورۃ جھاڑنے کے کام بھی آ سکتی ہے؟ بکریاں لے لو اور ان میں میرا حصہ بھی لگاؤ۔''

لیکن اس حدیث سے تعویذ، گنڈے اور جھاڑ

پھونک کے مطب چلانے کا جواز نکالنے سے پہلے عرب کے اُن حالات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے جن میں حضرت ابوسعیدؓ خدری نے یہ کام کیا تھا اور حضورؐ نے اسے نہ صرف جائز رکھا تھا، بلکہ یہ بھی فرمایا تھا کہ میرا حصہ بھی لگاؤ، تاکہ اس کے جواز و عدم جواز کے معاملہ میں ان اصحاب کے دلوں میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ عرب کے حالات اُس زمانے میں بھی یہ تھے اور آج تک یہ ہیں کہ پچاس پچاس، سوسو، ڈیڑھ ڈیڑھ سو میل تک آدمی کو ایک بستی سے چل کر دوسری بستی نہیں ملتی۔ بستیاں بھی اُس وقت ایسی نہ تھیں جن میں ہوٹل، سرائے یا کھانے کی دکانیں موجود ہوں اور مسافر کئی روز کی مسافت طے کر کے جب وہاں پہنچے تو سامانِ خورد و نوش خرید سکے۔ ان حالات میں یہ بات عرب کے معروف اصولِ اخلاق میں شامل تھی کہ مسافر جب کسی بستی پر پہنچیں تو بستی کے لوگ ان کی میزبانی کریں۔ اس سے انکار کے معنی بسا اوقات مسافروں کے لیے موت کے ہوتے تھے، اور عرب میں اِس طرزِ عمل کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے اِس فعل کو جائز رکھا کہ جب قبیلے والوں نے میزبانی سے انکار کر دیا تھا تو ان کے سردار کا علاج کرنے سے انھوں نے بھی انکار کر دیا، اور اس شرط پر اس کا علاج کرنے پر راضی ہوئے کہ وہ ان کو کچھ دینا طے کریں۔ پھر جب ان میں سے ایک صاحب نے اللہ کے بھروسے پر سورۂ فاتحہ اُس سردار پر پڑھی اور وہ اس سے اچھا ہو گیا تو طے شدہ اجرت قبیلے والوں نے لا کر دے دی اور حضورؐ نے اس اجرت کے لینے کو حلال و طیب قرار دیا۔ بخاری میں اس واقعہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس کی جو روایت ہے اس میں حضور کے الفاظ یہ ہیں کہ **اِنَّ احقَّ مَا اخذتم علیه اجرًا کتاب اللّٰہ** بجائے اس کے کہ تم کوئی اور عمل کرتے، تمھارے لیے یہ زیادہ برحق بات تھی کہ تم نے اللہ کی کتاب پڑھ کر اس کی اجرت لی۔ یہ آپ نے اس لیے فرمایا کہ دوسرے تمام عملیات سے اللہ کا کلام بڑھ کر ہے، علاوہ بریں اس طرح عرب کے اُس قبیلے پر حق تبلیغ بھی ادا ہو گیا کہ انھیں اس کلام کی برکت معلوم ہوگئی جو اللہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں۔ اِس واقعہ کو اُن لوگوں کے لیے نظیر قرار نہیں دیا جا سکتا جو شہروں اور قصبوں میں بیٹھ کر جھاڑ پھونک کے مطب چلاتے ہیں اور اسی کو انھوں نے

وسیلۂ معاش بنا رکھا ہے۔اس کی کوئی نظیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ وتابعین اور ائمۂ سلف کے ہاں نہیں ملتی۔

(حوالہ: تفہیم القرآن)

☆......☆......☆

ڈاکٹر گوہر مشتاق۔امریکہ

آن لائن میڈیا کے چیلنجز

نومبر میں ڈاکٹر صاحب کا مضمون ''نوجوانوں میں سوشل نیٹ ورکنگ کا رجحان'' شائع ہوا۔تازہ تحریر بھی اسی موضوع پر مزید فکر انگیز مندرجات پر مبنی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری زمانے (یعنی ہمارے موجودہ زمانے) کے فتنوں کے متعلق حدیث میں پیشین گوئی فرمائی تھی کہ:

''اِس اُمت کی ابتدا میں عافیت ہے اور آخری زمانے میں مصیبتیں اور برائیاں۔ایسا ہوگا کہ ایک فتنہ آئے گا اور مومن کہے گا کہ اِس میں میرے لیے ہلاکت ہے لیکن جب وہ دور ختم ہوجائے گا اور دوسرا فتنہ شروع ہوگا تو پچھلے فتنے کو بھلادے گا اور مومن پکار اُٹھے گا کہ فتنہ تو یہ ہے، فتنہ تو یہ ہے۔'' (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ)

یعنی پے در پے فتنے آئیں گے، ہر بعد میں آنے والا فتنہ پہلے سے سخت اور شدید تر ہوگا یہاں تک کہ اُن میں سے ہر نئے فتنے کو دیکھ کر اربابِ حق و ایمان بول اُٹھیں گے کہ سب سے بڑا فتنہ یہی ہے حالانکہ پھر اُس کے بعد وہ فتنہ آئے گا جس کا شر اور فساد دیکھ کر پچھلے فتنے بھول جائیں گے۔

بصری میڈیا(Visual Media) کے میدان میں ٹی وی پہلی ایجاد تھی۔ چنانچہ پوری دنیا کے بچوں اور نوجوانوں پر سب سے پہلے اِس ایجاد نے اپنے مہلک اثرات ڈالے۔نیلسن میڈیا ریسرچ رپورٹ کے مطابق 2 سے 5 سال کے بچے ہفتے میں اوسطاً 21.8 گھنٹے ٹی وی دیکھتے ہیں جبکہ 6 سے 11 سال کی عمر والے 18.3 گھنٹے ایک ہفتے میں ٹی وی دیکھتے ہیں۔[۱]

ٹی وی کو ناظرین یک طرفہ طور پر دیکھتے ہیں لیکن کمپیوٹر کی نوعیت ایسی ہے کہ اُس کی (interactive nature) کی وجہ سے اُس کے ساتھ انسان کا معاملہ دوطرفہ ہوتا ہے۔ اِس لیے کمپیوٹر کا سحر اپنے ناظرین پر ٹی وی کے سحر کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔امریکہ

۱؎ Nielsen Media Research (2000) "2000 Report on Television, The First Fifty Years". New York, Nielsen Media Research.

۲؎ Biocca, Frank (2000). "New Media Technology and Youth: Trends in the Evolution of New Media." Journal of Adolescent Health. 27S: 22-29.

کے ایسے نوجوان جن کی پیدائش ٹی وی کی ایجاد کے دور میں ہوئی یعنی 1960ء کی دھائی اور 1970ء کی دھائی (TV generation) اُن لوگوں نے اپنی زندگی کے مجموعی طور پر 7 سال ٹی وی کے سامنے گزارے لیکن 1990ء کی دھائی میں پیداہونے والی'' کمپیوٹر کے دور کی نسل'' (Computer Generation) کا معاملہ اُن سے بھی بدتر ثابت ہورہا ہے۔ امریکہ کی مشی گن سٹیٹ یونیورسٹی کی مائنڈ لیبارٹری (M.I.N.D. Labs) کے ڈائیریکٹر پروفیسر فرینک بائیوکا (Prof Frank Biocca) اِس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''کمپیوٹر اور اُس سے متعلقہ میڈیا پر اپنی زندگی کا وقت صرف کرنے کی بنیاد پر ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ 'انٹرنیٹ کے دور کی نسل' کے لوگ اپنی زندگی کے تقریباً 20 سال کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر یا اُس کے انٹرنیٹ پر کام کرتے ہوئے گزارتے ہیں۔'' ؎۲

اولین کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد کے موجدوں میں سے ایک مشہور انٹرفیس کے ایک خالق (Interface designer) ایلن کے (Alan Kay) نے کمپیوٹر کے لیے "Meta-Medium" کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کا مطلب ہے ''مختلف قسم کے میڈیا کا سنگھم''۔ امریکہ کے مشہور سائنسی جریدے Scientific American کے 1984ء کے شمارے میں ایلن کے (Alan Kay) نے بیان کیا ہے کہ ''کمپیوٹر ایک ایسا "Meta-Medium" ہے کہ جس میں ٹی وی، کتاب، ٹائپ رائٹر، ریڈیو اور ویڈیو گیم سسٹم (video game console) کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔'' ؎۱

گوکہ انٹرنیٹ، ٹی وی سے کئی گنا زیادہ طاقتور ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب آنے والے وقت میں ٹی وی اور انٹرنیٹ کا گٹھ جوڑ بڑھتا جا رہا ہے۔ پوری دنیا کے نوجوانوں کو تفریحی پروگرام مہیا کرنے والی کمپنی MTV Networks International (MTVNI) کی ایک تحقیق جو 2009ء میں شائع ہوئی اُس میں اُن کے محققین لکھتے ہیں:

"Though TV is important to youth in and of itself, it also is one of the most dominant ways of

---

؎۱ Kay, Alan (1984) "Computer software". Scientific American. 251:52-9.

؎۲ MarketingCharts staff (May 5, 2009) "TV Still Most Effective for Brands Targeting Youth". http://www.marketingcharts.com

directing youth online, with both TV and online media becoming increasingly interrelated."

”نہ صرف ٹی وی بذاتِ خود نوجوانوں کے لئے اہم ہے بلکہ نوجوانوں کو انٹرنیٹ کے استعمال کا درس دینے کا ٹی وی ہی سب سے بڑا ذریعہ بھی ہے۔ چنانچہ ٹی وی اور آن لائن میڈیا کا آپس کا تعلق اور رابطہ بڑھتا جارہا ہے۔“[۲]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ٹی وی اور کمپیوٹر، انسان کے ذہن کو کسی خیالی دنیا (Virtual world) میں لے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ٹی وی اور کمپیوٹر کے سامنے زیادہ وقت گزارنے والے انسان کی معاشرے کے لوگوں سے میل ملاقات نہایت کم ہو جاتی ہے۔ ٹی وی کے بعد کی ایجادات یعنی دیگر الیکٹرونک میڈیا مثلاً انٹرنیٹ، آئی پاڈ، کمپیوٹر گیمز وغیرہ نے معاملے کو صرف بد سے بدتر بنایا ہے اور ہر نیا فتنہ، اپنے سے پہلے والے فتنے سے زیادہ شدید بن کر ظاہر ہوا۔

دجالی دور کے فتنوں کی شدت کو ظاہر کرنے کے لئے اور عبرت کے لئے اِس مضمون میں صرف ایک سچا واقعہ پیش کیا جاتا ہے جو حال ہی میں امریکہ میں پیش آیا ہے۔ یہ تو صرف ایک واقعہ ہے جو ریکارڈ میں آگیا ہے وگرنہ موجودہ دور میں دجالی میڈیا، سوشل نیٹ ورکنگ اور انٹرنیٹ کے فتنے اتنے عام ہوتے جارہے ہیں کہ ایسی ”تھامس منٹگمری کی کہانی“ ہر دوسرے گھر کی کہانی بنتی جارہی ہے اور نہ جانے کتنے ہی مسلمان گھرانے بھی اِس آگ کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔ پس یہ انٹرنیٹ کے فتنے کی کہانی اپنے اندر بے شمار سبق رکھتی ہے:

تھامس منٹگمری ایک 46 سالہ شادی شدہ شخص تھا جس کا تعلق ریاست نیویارک سے تھا۔ اُس کی دو بیٹیاں بھی تھیں۔ اپنی بیوی سنڈی (Cindy) اور دو بیٹیوں کے ساتھ وہ بڑی خوش وخرم زندگی گزار رہا تھا۔ زندگی معمول پر جارہی تھی۔ ایک روز منٹگمری نے اپنے گھر کے لیے ایک کمپیوٹر خریدا اور اُس پر انٹرنیٹ نصب کیا۔ شروع شروع میں منٹگمری اور اُس کی بیٹیاں تھوڑا تھوڑا وقت انٹرنیٹ پر صرف کرتے تھے۔ منٹگمری عموماً پوگو (Pogo.com)، مائی سپیس

---

[۱] Labi, Nadya (21 August 2007). "An IM Infatuation Turned to Romance. Then the Truth Came Out". Wired. Magazine

(MySpace.com) اور یاہو (Yahoo.com) پر آن لائن چیٹنگ میں کچھ وقت صرف کرتا تھا۔ چیٹ رومز میں منٹگمری نے اپنی شناخت کے لیے جو آئی ڈی بنائی تھی اُس میں اُس نے اپنے آپ کو فوجی وردی میں ملبوس ایک اٹھارہ سالہ خوش شکل نوجوان امریکن فوجی بتایا تھا جس کی حال ہی میں عراق میں پوسٹنگ ہوئی تھی۔ مئی 2005ء کی ایک رات کو منٹگمری نوجوانوں کے ایک چیٹ روم (Teen Chat Room) میں داخل ہوا تو وہاں پر اُس کی ملاقات "Jessi" نامی ایک 18 سالہ لڑکی سے ہوئی۔ دونوں میں گفتگو بڑھی تو "Jessi" نے منٹگمری کو فوری میسجنگ (Instant-Messaging) شروع کر دی۔ بات کا آغاز "Jessi" کی طرف سے چھیڑ چھاڑ (flirtation) کی وجہ سے ہوا جیسا کہ منٹگمری نے بعد میں اِس عشق کی داستان کی ابتدا کے متعلق بتایا:

"I kept thinking, well, we're never going to meet.... I'll just play the game with her"[1]

لیکن بہت جلد معاملہ حقیقی محبت میں بدل گیا اور منٹگمری کے لئے پیچھے ہٹنا محال ہو گیا۔ "Jessi" نے منٹگمری کو اپنی چند تصاویر بھجوائیں جو یقیناً سنہرے بالوں والی ایک نوجوان (Teenager) لڑکی کی تصاویر تھیں۔ "Jessi" کو بھی تجسس تھا کہ منٹگمری کیسا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ منٹگمری نے "Jessi" کو اپنی فوجی بوٹ کیمپ کی 30 سال پرانی تصاویر بھجوا دیں۔ دونوں ہی یوگو، مائی سپیس اور یاہو پر روزانہ بڑی بڑی دیر تک ایک دوسرے سے چیٹنگ کرتے رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے جھوٹ بول رہے تھے۔ "Jessi" کی اصل شخصیت کیا تھی یہ قارئین کو اِس کہانی کے آخر میں پتہ چل جائے گا۔

پھر کیا تھا کہ منٹگمری نے روزانہ شام کو جاب سے واپس آ کر کئی کئی گھنٹے انٹرنیٹ کے سامنے گزارنے شروع کر دیئے جس کی وجہ سے اُس کی بیوی سِنڈی (Cindy) فکرمند ہونا شروع ہو گئی۔ کبھی تو ایسا ہوتا کہ اُن کی 12 سال یا 14 سال کی بیٹیوں میں سے کوئی بیٹی کمپیوٹر پر بیٹھی ہوئی ہوتی تو منٹگمری زبردستی اپنی بیٹی کو یہ کہہ کر ہٹا دیتا کہ اُس نے کمپیوٹر پر کوئی گیم کھیلنی ہے۔ ایک دن منٹگمری کی ایک بیٹی نے باپ کی غیر موجودگی میں یہ

---

[1] Stokes, Paul (March 8th, 2010). "Peter Chapman targeted thousands of young girls". The Telegraph (London). http://www.telegraph.co.uk/

[2] Godwin, Maurice (Summer 2005). "CyberMurder.com: Bound for Death - Part 1". Web Mystery Magazine. Vol. III, Issue 1.

دریافت کیا کہ اُس کے باپ کا کسی "Jessi" نامی لڑکی سے کمپیوٹر پر معاشقہ "Online Relationship" چل رہا ہے۔ جب بچیوں کی ماں سِنڈی نے منٹگمری کے کمپیوٹر کے فولڈرز چیک کیئے تو اُس کی حیرت کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے "Jessi" کی سینکڑوں آن لائن تصاویر، عشقیہ خطوط اور فوری پیغامات (Instant Messages) منٹگمری کے نام دریافت کیے۔ سِنڈی شدید غصے میں آگئی جب اُس نے دیکھا کہ "Jessi" تو سِنڈی کی اپنی بیٹیوں کی عمر کی ہے۔ پھر اگلے روز سِنڈی نے اپنے خاوند منٹگمری کے نام "Jessi" کی طرف سے ڈاک میں ایک پارسل موصول کیا۔ جب سِنڈی نے اُس پارسل کو کھولا تو سِنڈی پر صدمے کا ایک اور پہاڑ ٹوٹا کیونکہ اُس پارسل میں "Jessi" نے منٹگمری کے لیے بھڑکانے والے زنانہ کپڑے بھیجے ہوئے تھے۔ سِنڈی ایک سمجھدار اور معاملہ فہم خاتون تھی۔ اُس نے "Jessi" کو ایک خط لکھا اور اُس میں اپنی پوری فیملی کی ایک گروپ فوٹو ارسال کی۔ سِنڈی نے "Jessi" کے نام خط میں لکھا:

''میں ذرا اِس فیملی فوٹو میں موجود لوگوں سے تمہارا تعارف کرواتی چلوں۔ تصویر کے درمیان میں جو شخص ہے یہ تھامس منٹگمری ہے جو 1989ء سے میرا خاوند ہے.... اب اُس کی عمر 46 سال ہے۔ ہمارے گھر میں 18 سال کا کوئی نوجوان موجود نہیں ہے۔''

ایک دانشمند خاتون کی طرح سِنڈی نے "Jessi" کو نصیحت کرتے ہوئے لکھا:

''میں نے تمہارے خطوط سے تمہاری عمر کا جو اندازہ لگایا ہے اُس کے مطابق تمہاری عمر تو میری بیٹیوں جتنی ہے نہ کہ میرے جتنی یا منٹگمری کی عمر جتنی۔ کیا تمہاری عمر 18 سال سے کم تو نہیں ہے؟ اگر یہ بات ہے تو منٹگمری پر عدالت میں اِس بات پر کیس ہو سکتا ہے کہ وہ کسی 18 سال سے کم عمر لڑکی کو ورغلا رہا ہے۔''

اپنے خط کے اختتام میں سِنڈی نے "Jessi" کو وہ معرکۃ الآراء نصیحت کی جو سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے:

"Do not trust words on a computer"

کمپیوٹر پر کسی کے لفظوں کا اعتبار مت کرنا۔

شام کو جب منٹگمری گھر واپس آیا تو سِنڈی کی اپنے خاوند سے شدید تلخ کلامی ہوئی۔ سِنڈی نے اُسے کہا کہ اب دونوں کو اپنے بستر الگ کر لینے چاہیں۔ چنانچہ

منٹگمری اپنے گھر کے تہہ خانے میں اپنا کچھ سامان اور کمپیوٹر لیکر چلا گیا۔ اپنے دفتر میں منٹگمری نے اپنے جاب کے ساتھیوں سے اپنے آن لائن معاشقے کا اول روز سے تذکرہ کیا ہوا تھا۔ اب اُس نے اپنے ہم پیشہ ساتھیوں کو بتایا کہ بہت جلد وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر ریاست مغربی ورجینیا اپنی زندگی کی محبت کے پاس چلا جائے گا۔

جب منٹگمری کی بیوی کے ذریعے "Jessi" کو منٹگمری کی دھوکہ بازی کا علم ہوا تو اُس نے یہ تعلق توڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اُس کے بعد "Jessi" نے منٹگمری سے انتقام لینے کی خاطر یہ کیا کہ "Pogo.com" جہاں یہ دونوں کبھی آن لائن گیمز کھیلا کرتے تھے وہاں پر جا کر منٹگمری کے دوستوں کی لسٹ (Friends List) کو ڈھونڈا اور اُن لوگوں سے رابطے کرکے "Jessi" نے منٹگمری سے اپنے تعلقات ٹوٹنے اور اُس کی دھوکہ بازی کا خوب رونا رویا۔ وہاں پر "Jessi" کی نظر 22 سالہ برائن باریٹ (Brian Barrett) کی پروفائل پر پڑی جو کہ منٹگمری کے ساتھ آفس میں کام کرتا تھا۔ برائن کو منٹگمری کے "Jessi" کے ساتھ معاشقے کا پہلے سے علم تھا کیونکہ منٹگمری اکثر اُن سب کے سامنے اپنے اِس معاشقے کے متعلق شیخی مارتا رہتا تھا۔ برائن (Brian) نے "Jessi" کو منٹگمری کی دھوکہ بازی کے واقعے کے ضمن میں تسلی دی۔ اِس طرح سے برائن اور "Jessi" کے درمیان ایک نیا آن لائن معاشقہ (Online Affair) شروع ہوگیا اور اُنھوں نے اپنے چیٹ روم میں ہر کسی کو بتانا شروع کردیا کہ منٹگمری جھوٹا اور دغاباز ہے۔

جب منٹگمری کو اِس بات کا علم ہوا کہ "Jessi" نے منٹگمری کے ہم پیشہ رفیق کے ساتھ معاشقہ شروع کردیا ہے تو وہ آگ بگولا ہوگیا۔ بالآخر ایک دن جب رات کو دس بجے برائن نے بفلو، نیو یارک میں اپنی فیکٹری کی جاب سے چھٹی کی اور وہ چلتا ہوا اپنے پارکنگ لاٹ میں جا کر اپنی گاڑی میں بیٹھا تو منٹگمری اُس کا مسلسل پیچھا کر رہا تھا۔ ابھی برائن نے اپنی گاڑی سٹارٹ کرنی تھی کہ اچانک منٹگمری 0.30 کیلبر کی رائفل کے ساتھ نمودار ہوا۔ منٹگمری نے برائن پر دو فائر کیے جن میں سے ایک برائن کے بازو پر اور دوسرا اُس کی گردن پر لگا جس سے وہ جگہ پر ہلاک ہوگیا۔ منٹگمری جائے وقوع سے فرار ہوگیا۔ یہ 15 ستمبر 2006ء میں جمعہ کی رات تھی۔ دو روز کے بعد پارکنگ

لاٹ کے ایک راہ گیر نے برائن کی لاش پر نظر پڑنے پر پولیس کو اطلاع دی۔ منٹگمری نے تفتیشی افسروں کے سامنے برائن کے قتل سے لاتعلقی کا اظہار کیا لیکن جب اُنھوں نے برائن کے گھر جا کر تلاشی لی اور اُس کے کمپیوٹر کا معائنہ کیا تو اُنھیں بہت سا مشکوک مواد ملا مثلاً منٹگمری کے "Jessi" کے نام فوری پیغامات، بعد میں دونوں کے آپس کے جھگڑے جن میں برائن کا بھی ذکر تھا وغیرہ۔ چنانچہ منٹگمری کو حراست میں لے لیا گیا۔ نیویارک کی عدالت کے جج وَولف گینگ نے منٹگمری کو 20 سال قید کی سزا سنائی اور رہائی کے بعد مزید 5 سال کی کڑی نگرانی کا بھی آرڈر دیا۔ جیل میں قید کی سزا شروع ہونے کے بعد منٹگمری کو اُس کی بیٹیوں نے ایک خط لکھا جس میں انھوں نے اُسے بتایا کہ وہ اُس سے جیل میں ملاقات کے لیے نہیں آنا چاہتیں اور اُس کی بیوی نے بھی اُس سے طلاق حاصل کر کے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ یہ سن کر منٹگمری نے جیل میں خودکشی کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

کیس کی تفتیش کے دوران یہ راز بھی افشا ہو گیا کہ "Jessi" ایک 18 سالہ نوجوان لڑکی نہیں تھی جیسا کہ آن لائن پروفائل فوٹوز میں اُس نے دکھایا تھا۔ تفتیشی پولیس افسر لفٹیننٹ ران کینین (Lieutenant Ron Kenyon) کو قتل ہونے والے نوجوان برائن کے موبائل فون سے "Jessi" کا فون نمبر ملا۔ ران کینین نے "Jessi" کو کال کی اور بتایا کہ وہ اُس قتل کے کیس میں تفتیش کے لیے تیار رہے۔ بے شک "Jessi" فون پر اپنی آواز سے ایک 18 سال کی لڑکی ہی لگتی تھی۔ لیکن تفتیشی افسر ران کینین کئی گھنٹے کا گاڑی کا سفر کر کے مغربی ورجینیا "Jessi" کے گھر پہنچا تو اُسے پتہ چلا کہ کمپیوٹر کی سکرین پر 18 سالہ سنہرے بالوں والی "Jessi" نامی لڑکی جو کہ برائن اور منٹگمری دونوں کی محبت کا مرکز بنی ہوئی تھی وہ دراصل ایک بھاری جسم کی (Plump) 45 سالہ عورت تھی جو دو بچوں کی ماں بھی تھی۔ اُس کے سر پر چھوٹے کٹے ہوئے گہرے براؤن رنگ کے بال تھے۔ اُس عورت کا اصل نام میری شائلر (Mary Shieler) تھا۔ یہ عورت 23 سال سے شادی شدہ تھی اور اپنے خاوند اور دو بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اپنی آن لائن پروفائل میں میری شائلر نے "Jessi" نامی 18 سالہ لڑکی کا روپ دھارا ہوا تھا اور دراصل اپنی 18 سالہ بیٹی کی تصاویر کو منٹگمری اور برائن کو بھیجنے کے لیے استعمال کرتی تھی۔ اُس عورت نے اپنی

بیٹی کو بتائے بغیر تیرا کی کے لباس تک میں اپنی بیٹی کی تصاویر منٹگمری کو ورغلانے کے لیے بھیجیں اور بتایا کہ یہ اُس کی اپنی تصاویر ہیں۔!

نیو یارک کے وکیل اِس عورت کو بھی سزا دلوانا چاہتے تھے کہ اُس نے کئی زندگیوں کو تباہ کر ڈالا، اُس نے منٹگمری کی بیوی اور دو بیٹیوں کا گھر اُجاڑ دیا، منٹگمری سے قتل کروا ڈالا، برائن بیرٹ جو کہ 22 سالہ نوجوان تھا اور نیو یارک میں پڑھنے کے لیے آیا ہوا تھا اُس کا قتل کروا دیا اور اُس لڑکے کے والدین اور بہن بھائیوں کی امیدوں کا خون کر دیا۔ تاہم نیو یارک کی عدالت نے دجالی نظام کے ایک آنکھ والے ایجنٹوں یعنی کمپیوٹر، چیٹنگ، کیمرہ وغیرہ پر کوئی الزام نہ آنے دیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ میری شائکر ("Jessi") نے گو کہ اِس تمام واقعے میں اخلاقی حدود کو تو پار کر ڈالا لیکن کوئی چیز ''قانون'' کے خلاف نہیں کی۔

میری شائکر ("Jessi") قانون کی گرفت سے تو بچ گئی لیکن اپنے جرم کے گھناؤنے اثرات سے اپنی زندگی کو نہ بچا سکی۔ جب کیس کھلنے پر میری شائکر (Jessi) کے خاوند کو اُس کی خیانت اور منٹگمری کے ساتھ انٹرنیٹ پر ناجائز تعلقات کا علم ہوا تو اُس نے میری شائکر کو طلاق دے دی کیونکہ وہ ایسی غلیظ عورت کے ساتھ کیسے رہ سکتا تھا۔ میری شائکر کی بیٹی کا نام Jessica تھا لیکن اسی کا نام اور تصاویر میری شائکر اپنی شناخت کے طور پر آن لائن استعمال کرتی تھی۔ اُس لڑکی نے اپنی ماں کے مکروہ کردار کو دیکھ کر اُس سے اپنے تعلقات توڑ دیئے اور ریاست ورجینیا نقل مکانی کر کے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔

یہ انٹرنیٹ کیس ریاست نیو یارک کے قانون دانوں کے لیے اتنا پیچیدہ تھا کہ انھوں نے اسے ''عجیب محبت کا تکون'' (Bizarre Love Triangle) کا نام دیا۔ اِس کیس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مورخ خاتون کرسٹل ہاکنز (Kristal Hawkins) رقمطراز ہیں:

''اِس کہانی کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ 22 سالہ برائن بیرٹ اس عجیب محبت کے تکون کا شکار ہو گیا۔ اُسے ایک ایسے آدمی نے قتل کیا جو کہ وہ نہیں تھا جو وہ انٹرنیٹ پر بتا رہا تھا (یعنی منٹگمری)، جو کہ ایک ایسی عورت کی محبت میں گرفتار تھا جو کہ اصل میں وہ نہیں تھی جو وہ انٹرنیٹ پر اپنے آپ کو بتا رہی

تھی (یعنی Jessi)۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اِس آن لائن محبت کے تکون میں ہر کوئی دوسرے کو دھوکہ دے رہا تھا۔"

موجودہ دور کے نوجوانوں میں سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس بہت مقبول ہیں۔ وہ اپنے فارغ اوقات میں سے ہر ہر لمحہ انہی آن لائن سائٹس پر گزارنا پسند کرتے ہیں لیکن ایسا کرنے کے دوران کئی نوجوان لڑکیاں لڑکے اپنی عزت، اپنے اخلاق اپنا پیسہ، اپنی پاک دامنی حتیٰ کہ اپنی زندگی بھی انٹرنیٹ پر موجود شکاری مردوں (Scammers Predators) کے ہاتھوں ضائع کر بیٹھتے ہیں۔

کمپیوٹر کے مجرم افراد (Cyber Criminals)، آن لائن بھیڑیئے (Online Wolves) بچوں سے جنسی رغبت رکھنے والے (Paedophiles) فیس بک قاتل (Facebook Killers)، انٹرنیٹ قاتل اور چیٹ روم قاتل (Chat Room Killers) اِن سب میں ایک بات مشترک ہے کہ یہ سب لوگ اپنے انسانی شکار پکڑنے کے لئے "ایک آنکھ والے دجال کے ایجنٹوں" کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ انٹرنیٹ کے مجرم اوپر بیان کی گئی سائٹس کے علاوہ آن لائن ڈیٹنگ سائٹس (Online dating Servies)، انٹرنیٹ گیمز (Online role playing games)، اور یاہو گروپس کو بھی اپنے شکار پکڑنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص انٹرنیٹ پر اپنی نقلی شناخت (Fake online identity) بنائے تو اس کی اصلیت جانچنے کے معاملے میں یہ تمام ویب سائٹس بے بس ہیں۔ مثلاً بیلجیئم سے شروع ہونے والی مشہور سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹ نیٹ لاگ (Netlog) کے پورے یورپ میں 56 ملین سے زیادہ استعمال کرنے والے ہیں اور نیٹ لاگ نے اِس معاملے میں برملا اپنی بے بسی کا اعتراف کیا ہے:

"There is currently no 100 per cent fail-safe way of confirming someone's identity online."

یعنی اس وقت کسی کی آن لائن شناخت کی تصدیق کرنے کے لیے کوئی بھی ایسا طریقہ موجود نہیں ہے جو سو فی صد کامیاب ہو۔[1]

ڈاکٹر ماریس گاڈوِن (Dr. Maurice Goodwin) امریکہ کے عدالتی سائنس (Forensic Science) کے ایک ماہر قانون ہیں۔ جن خاندانوں

کے افراد قتل یالاپتہ ہوجاتے ہیں، ڈاکٹر ماریس اُن خاندانوں کے لیے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی طرف سے بطورِ مشیر (Law Enforcement Consultant) کے بھی کام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ماریس بتاتے ہیں کہ جو لوگ انٹرنیٹ پر دوسروں کا استحصال کرنے کا پلان بناتے ہیں وہ ''مارڈی گراس اثر'' (Mardi Gras Effect) پر انحصار کرتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کے مطابق Mardi Gras Effect کا مطلب ہے انٹرنیٹ پر اپنی شناخت کو چھپانے کی صلاحیت یعنی (Ability to hide one's identity on the Internet)۔ ایسے لوگ انٹرنیٹ کو استعمال کر کے معصوم لڑکیوں کو پھانستے ہیں، اُن کی آبروریزی کرتے ہیں اور بعض اوقات پھر اُن کے قتل بھی کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر ماریس بیان کرتے ہیں:

''انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی تاریک اور پُراسرار دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو عجیب وغریب قسم کے تجربات اور مہمات کرتے ہیں۔ اپنے آن لائن سکرین نام (Online Screen Name) کے لبادے میں چھپے ہوئے بعض لوگ اپنے استعمال شدہ انڈر وَیئر بیچتے ہیں تو بعض لوگ ایسے انسانی شکار کی تلاش میں ہوتے ہیں جنھیں وہ چھپ کر قتل کر ڈالیں...... کسی کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ انٹرنیٹ پر اپنا اصلی نام بتائیں اور اکثر لوگ اپنی اصلی شناخت بتاتے بھی نہیں ہیں۔ اُس کے برعکس، انٹرنیٹ کی سائٹس استعمال کرنے والے حضرات ایک یا ایک سے زیادہ ہینڈل (Handle) استعمال کرتے ہیں (یعنی انٹرنیٹ پر استعمال ہونے والا آدمی کا عرف یا Internet Nickname) یہی ''ہینڈل'' اُس کی شناخت کو چھپانے کا لبادہ ہوتا ہے۔

چیٹنگ کمرے (Chat Rooms) اور (Internet Relay Chat) IRC حقیقی ٹائم فریم میں کام کر رہے ہوتے ہیں اور اُن میں شامل تمام لوگوں کے پیغامات (Messages) فوری طور پر پوسٹ ہوتے ہیں اور اُن کے جوابات لکھے جاتے ہیں اور ہر کوئی اُن کو پڑھ رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح پرائیویٹ چیٹ رومز کا بندوبست بھی کیا جا سکتا ہے۔ "Private chat rooms" میں بھی ہینڈل (Handles) ہی استعمال ہوتے ہیں۔ اِس گمنامی کی حالت (Anonymity) کی وجہ سے چیٹ رُومز اور نیوز گروپس کے ملاقاتیوں (Visitors) کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ جس کسی کی چاہیں اُس کی

شخصیت(Persona) کا رُوپ دھار لیں۔ یہ چیز دھوکہ دینے کے لیے بہترین راستہ مہیا کر دیتی ہے۔''۲

''ہینڈل'' انٹرنیٹ پر استعمال ہونے والا عرف ہوتا ہے جیسا کہ Instant messaging اور سکائپ میں کسی شخص کو اُس کے سکرین کے نام یا ''ہینڈل'' سے رابطہ کرتے ہیں۔ٹیکنالوجی ریسرچ کے امریکی ادارے گارٹنر (Gartner) کے ایک تجزیہ نگار ادیب غُبریل نے 2012ء اور اُس کے بعد کی موبائل صنعت کے متعلق رپورٹ میں کہا تھا:

''عنقریب لوگ آپس میں آن لائن تعلقات قائم کرنے کے لیے ایک دوسرے سے فون نمبر یا ای میل نہیں مانگیں گے بلکہ کہا کریں گے، آپ کا ہینڈل (Internet Nickname) کیا ہے؟''

اِس کتاب کے پہلے حصے میں بیان کی گئی کہانیوں اور واقعات میں ہم نے دیکھا ہوگا کہ سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس اور انٹرنیٹ چیٹنگ کرنے والی لڑکیاں اور لڑکے اسی ''مارڈی گراس اثر'' (Mardi Gras Effect) کا شکار ہوئے تھے جس کے نتیجے میں بھیانک جرائم اور اندوہ ناک وارداتیں ہوئیں۔انٹرنیٹ چیٹ رومز، فوری میسجنگ اور سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس (مثلاً فیس بک، ٹوئٹر، مائی سپیس، فرینڈ سنٹر، وغیرہ) اپنے استعمال کرنے والوں کو ''نظر کا دھوکہ'' دینے کے علاوہ ''عمر کا دھوکہ'' بھی دیتی ہیں۔ جو لوگ چیٹ رومز یا سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس پر جاتے ہیں اُن پر اِن دجالی ایجنٹوں کا ایسا جادو ہو جاتا ہے کہ ہمیشہ انٹرنیٹ پر ملاقات کرنے والے شخص کی عمر کا اندازہ لگانے میں غلطی کرتے ہیں اور ہمیشہ آن لائن ملاقات کرنے والے شخص کے متعلق یہی سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی نوجوان لڑکا یا لڑکی ہے۔شاید اُن کا اِس میں کوئی قصور بھی نہیں کیونکہ یہ ''جوان ہونے کا تأثر'' دجال کی ایک صفت بھی ہے جیسا کہ حدیث میں بیان ہوا ہے:

اِنَّهُ شَابٌّ قَطَطٌ ، عَيْنُهُ طَافِئَةٌ (صحیح مسلم)

(صحيح مسلم ،كتاب الفتن و اشراط الساعة، حديث5228)

''دجال ایک جوان شخص ہوگا، اُس کے بال گھنگھریالے ہوں گے اور وہ ایک آنکھ سے اندھا (کانا) ہوگا۔''

چنانچہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ دجال کے ایجنٹوں میں بھی یہ صفات موجود ہیں یعنی ''جوانی کا جھانسہ''

اور ''ایک آنکھ''۔ پچھلے صفحات میں بیان کیے گئے تھامس منٹگمری کے واقعے میں اِس آن لائن معاشقے سے پہلے وہ ایک شفیق باپ اور محبت کرنے والا خاوند تھا۔ وہ اپنی بچیوں اور بیوی کو باقاعدگی سے شام کو سیر کروانے لے کر جاتا تھا، اپنی بچیوں کو سکول چھوڑتا اور واپس لاتا تھا لیکن وہ کمپیوٹر کے ایک بٹن کا دبانا تھا کہ وہ اُس معاشقے کی دلدل میں پھنستا چلا گیا۔ جس انٹرنیٹ چیٹ روم (chatroom) میں منٹگمری نے جانا شروع کیا اُسی روم میں اُس کی ملاقات "Jessi" نامی لڑکی سے ہوئی جس کا دعویٰ تھا کہ وہ 18 سالہ سفید نام لڑکی ہے۔ اُس کا دل جیتنے کے لیے منٹگمری نے بھی جھوٹ کہہ دیا کہ وہ ایک نوجوان امریکی فوجی ہے جسے عنقریب حکومت عراق بھیجنے لگی ہے۔ دونوں کا ایک دوسرے کے متعلق یہی یقین اور ایمان تھا کہ اُن کا محبوب ''جوان'' ہے لیکن حقیقت میں "Jessi" 18 سالہ لڑکی نہیں بلکہ 45 سالہ بھاری جسم کی (Plump) عورت تھی جو دو بچوں کی ماں بھی تھی اور منٹگمری 45 سالہ کا شخص تھا جو دو بچیوں کا باپ تھا۔ 22 سالہ برائن بیرٹ بھی "Jessi" کی محبت میں اسی لیے گرفتا رہوا کہ اُس نے یہ گمان کیا کہ "Jessi" شاید 18 سالہ لڑکی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اِس محبت کے تکون (Online Love Triangle) میں ہر کوئی ''جوانی'' کی تلاش میں تھا اور انھوں نے ایک دوسرے کی عمروں کا اندازہ کرنے میں صریح غلطی کی۔

ایسا گمان ہوتا ہے کہ انٹرنیٹ لوگوں کی ''جوان عمر کا فریب نظر'' (Illision of young age) دکھاتا ہے اور لوگ ایک دوسرے کی عمر کے بارے میں فوراً غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ہمیشہ دوسرے کو جوان اور نیک فطرت سمجھتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر شروع ہونے والے تعلقات اور دوستیوں کے معاملے میں یا تو لوگ دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں یا پھر خود دھوکے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انٹرنیٹ چیٹنگ اور سوشل نیٹ ورکنگ کی دنیا میں لوگ بڑی آسانی سے جوان شخص کا بھیس دھار لیتے (Impersonate as young) ہیں۔ جب اُن کی جعلی آن لائن شخصیت کا بھانڈا پھوٹتا ہے اُس وقت تک اکثر بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے اور وہ اپنی واردات کر چکے ہوتے ہیں۔ اسی خصوصیت کو عربی زبان میں ''دجل'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ سب سے بڑے دھوکے باز یعنی دجال کے یہ الیکٹرانک ایجنٹ بھی لوگوں کو دھوکے میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

☆☆☆

نعت شریف

جھک جاؤ کہ یہ بارگہہِ ہر دوسراؑ ہے
بچھ جاؤ کہ وہ پیکرِ دیں اس میں دھرا ہے

دستار رسالتؐ ہے یہ محبوبؐ الٰہ کی
زم زم ہے ہر اک پیچ تو ہر خم میں حرا ہے

وہ سر کبھی دنیا میں نگوں ہو نہیں سکتا
سوداشہہِ لولاکؐ کا جس سر میں بھرا ہے

بے خوف چلے آؤ جو مانگو گے ملے گا
بازار محبت ہے یہاں سودا کھرا ہے

لے نام الٰہ قدموں میں آجائے گا ساحل
طوفان کی موجوں میں اگر آ کے گھرا ہے

(نجمہ یاسمین یوسف)

غزل

آنسوؤں سے اُجال رکھا ہے
ہم نے گھر کا خیال رکھا ہے

دل کے دامن میں اور کچھ بھی نہیں
رنج و آہ وملال رکھا ہے

اشک پینے پلانے پڑتے ہیں
غم کا پودا جو پال رکھا ہے

اب یہ قسمت کہ کچھ ملے نہ ملے
ہم نے سکہ اچھال رکھا ہے

کیا بتائیں کہ موت کو ہم نے
کس بہانے سے ٹال رکھا ہے

زندگی بھی عجب معما ہے
ہر قدم پر سوال رکھا ہے

ہر بلندی کی آخری حد پر
ایک حرفِ زوال رکھا ہے

(کرامت بخاری)

تحفظ کا سائباں

بچیوں سے زیادتی کے بڑھتے ہوئے واقعات پر

میں بنتِ آدم! میں بنت حوا
میں گھر کی زینت! وطن کی عزت
مری یہ چادر! میرا تحفظ
مرا تقدس! میری حیا ہے
مرا تقدس بحال رکھو
مری ردا کا خیال رکھو
مجھے ہراساں کرے جو کوئی
اسے سزا دو
برہنہ سر کرنے والوں کے
ہاتھ کاٹ ڈالو
مرے یہ مجرم، مرے یہ قاتل
مرے محلے، مرے وطن میں
مری ہی گلیوں میں گھومتے ہیں
مرے تعاقب سے ان کو روکو
انہیں مجھے گھورنے پہ ٹوکو
یہ اوڑھنی ہے وقار مرا
میں صنف نازک
مجھے تحفظ کا سائباں دو
میں خوف بستی میں جی رہی ہوں
مجھے اماں دو!!

(شمیم فاطمہ)

غزل

جسم مجھ کو دیا ہے مٹی کا
کیا بھروسہ ، بھلا ، ہے مٹی کا

ہم یہاں بیٹھے ہیں فلک اوڑھے
جگ میں میلا لگا ہے مٹی کا

کس قدر بوجھ اٹھائے رکھا ہے
یہ تو بس حوصلہ ہے مٹی کا

یوں نہیں کہ امان کوئی نہیں
کچھ نہ کچھ آسرا ہے مٹی کا

خوب سامانِ شب میسر ہے
خواب، دل اور دیا ہے مٹی کا

کام سارا سمیٹئے صاحب!
اب یہی مشورہ ہے مٹی کا

شورِ ہستی میں چھیڑتے ہیں صہیبؔ
تذکرہ گاہے گاہے مٹی کا

(صہیب اکرام)

سودوزیاں

ثروت لاؤنج میں آئی اور اپنا پرس صوفے پر ڈالتی ہوئی خود بھی ڈھے گئی۔

''اف تھک گئی،اوپر سے گرمی۔''

''ممی کہاں ہیں؟''عرشی جو لیپ ٹاپ لیے بیٹھی تھی اس نے نظریں ہٹا کر ثروت سے پوچھا۔

''آ رہی ہیں ڈرائیور سے سامان اتروا رہی ہیں۔''

''آج بھی کامیابی ہوئی یا......''

''ارے کہاں، وہ جو چند ایک دکانیں رہ گئی تھیں آج تو وہ بھی کھنگال لیں۔ پر مطلب کا کہیں نہیں۔تم کو کہا تھا،تم نے بھی کچھ کیا یا نہیں؟''اب ثروت عرشی سے پوچھ رہی تھی۔

''میں آج یہی کرتی رہی، سارا دن نیٹ پر سرچنگ کرتی رہی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔''عرشی نے کہا اور اسی وقت ممی کمرے میں داخل ہوئیں۔ملازمہ دونوں کے لیے جوس لے آئی تھی۔

''ثروت تم ابھی آئی ہو یا جا رہی ہو؟''ممی نے جوس کا گلاس خالی کرتے ہوئے پوچھا۔

''بس ممی اب میں بھی چلوں، بچے بھی انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''پھر تم نے بمبئی جانے کا کیا سوچا۔''

''ہائیں بمبئی؟''ثروت سے پہلے عرشی نے حیرانگی سے پوچھا۔

''ہاں وہاں ایک دکاندار نے یہ مشورہ دیا ہے کہ جس قسم کا برائیڈل ڈریس ہم چاہ رہے ہیں وہ یہاں تو ملنے کا نہیں۔اس کے لیے ہمیں پڑوسی ملک ہی جانا پڑے گا وہاں شاید مطلب کا مل جائے۔''

''ٹھیک ہے ممی پھر آپ ٹکٹ منگوائیں چلتے ہیں۔''ثروت نے پہلے عرشی سے اور بعد میں ممی کو جواب دیتے ہوئے کہا اور اپنا بیگ لے کر دونوں کو ہاتھ ہلاتی لاؤنج سے نکل گئی۔

''ممی میں نے آپ کو جس ڈیزائنر کے پاس جانے کا کہا تھا جہاں سے میری دوست فضہ کی بہن نے اپنا سوٹ بنوایا تھا آپ وہاں نہیں گئیں؟''عرشی

پوچھ رہی تھی۔

''وہاں بھی گئے تھے، وہ زیادہ سے زیادہ صرف دس پندرہ لاکھ کا جوڑا تھا، ثروت کو کچھ خاص پسند نہیں آیا تھا پھر اُسی دکاندار نے تو مشورہ دیا کہ آپ بھارت چلی جائیں وہاں آپ کو اپنے مطلب کا مل جائے گا۔ یہاں تو اس قیمت سے زیادہ کا ملنا مشکل ہے اور جیسا آپ لوگ چاہ رہے ہیں وہ تو تقریباً ناممکن۔''

''اوکے'' عرشی سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''اب بھلا سوچو بزنس ٹائیکون چودھری عارف علی کی بہو اور اپنی شادی والے دن کوئی معمولی جوڑا پہنے، ناممکن۔'' ممی کے لہجے میں فخر بھرا ہوا تھا۔ جواب میں عرشی سر ہلانے لگی۔

☆......☆......☆

پھر چند دن کے اندر ہی ممی، ثروت اور بیٹے ایاز کے ساتھ محوِ پرواز تھیں۔ پاسپورٹ تو تھے ہی بس ٹکٹ ہی لینے تھے اور رہا ویزہ تو وہ تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہاں جن ڈیزائنرز کے بارے میں بتایا گیا ان کے پاس جا کر بھی ان تینوں کو مایوسی ہی ہوئی تھی۔ وہاں ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ قسم کا لباس تھا لیکن ممی اور ثروت کے معیار پر کوئی بھی پورا نہیں اتر رہا تھا۔ دو دن وہ لوگ وہاں مختلف دکانیں دیکھتے رہے۔

''محترمہ اس سے بڑھ کر ملنا، سوری ......''دکاندار نے سب سے قیمتی سوٹ کو بھی ریجیکٹ کرتی ثروت سے کہا۔

''دیکھیں میں چاہ رہی تھی کہ......''

''میں اچھی طرح سے آپ کی بات سمجھ رہا ہوں مجھے عروسی لباس تیار کرتے تقریباً تیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ میں یہاں عام لباس نہیں بلکہ وزراء اور ملک کے چوٹی کے بزنس مینوں اور صنعتکاروں کی بچیوں کے لیے خاص تیار کرواتا ہوں آپ کو ہمارے ہاں کے ڈیزائن پورے برصغیر میں کہیں نہیں ملیں گے۔'' اس نے حقیقت بتائی تھی۔''لیکن آپ لوگ جو چاہ رہے ہیں اس طرح کا ایک لباس پچھلے ہفتے دوبئی میں، میں نے دیکھا ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں وہاں کا پتہ آپ کو دے دیتا ہوں۔اب آگے آپ کی قسمت۔'' دکاندار نے انھیں امید دلائی۔

ثروت نے ایاز کو دیکھا''کیا خیال ہے؟ چلیں دوبئی۔''

''ٹھیک ہے وہاں بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' ایاز نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''ثروت پھر جو شاپنگ کرنی ہے یہاں سے وہ کرلو، ہم کل ہی وہاں چلتے ہیں۔'' می نے بھی حامی بھرتے ہوئے کہا اور تینوں نے دکاندار سے وہاں کا پتہ لیا اور دکان سے باہر آ گئے۔

پھر ثروت نے کچھ بیش قیمت ساڑھیاں، جیولری وغیرہ وہاں سے خریدی اور تینوں اگلے دن دبئی کے لیے عازم سفر ہوئے اور یہ اُن کی خوش قسمتی تھی کہ مطلوبہ جوڑا دکان میں ابھی موجود تھا۔

''بیوٹی فل!'' بے ساختہ ہی ثروت کے منہ سے نکلا تھا اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ می بھی اس جوڑے کو دیکھ کر کچھ دیر کے لیے تو دنگ ہی رہ گئی تھیں۔ ایاز بھی خیالوں میں وہ جوڑا آئمہ کو پہنے دیکھ رہا تھا۔

''میڈم اس جوڑے کی قیمت ستر لاکھ پاکستانی روپیہ ہے۔'' دکاندار نے ریال کی قیمت کو پاکستانی روپیہ میں تبدیل کر کے بتایا۔''اس میں سونے کے تاروں اور اصلی موتیوں کا کام ہے۔'' وہ جو کہہ رہا تھا ،وہ نظر بھی آ رہا تھا۔

''نو پرابلم'' ثروت مسکرا کر بولی۔ جوڑے کی چمک آنکھوں کو چندھیا رہی تھی۔ اسے اپنا گوہر مقصود مل گیا تھا یہی کافی تھا۔ تینوں کو متفقہ طور پر وہ جوڑا پسند آ گیا تھا تو پھر خریدنے میں انھوں نے دیر نہیں لگائی تھی۔

''یہ تو آپ کی قسمت تھی کہ یہ جوڑا بچ گیا ورنہ یہ تو یہاں کے ایک وزیر صاحب کی صاحبزادی کے لیے خاص طور پر تیار کروایا گیا تھا کئی ماہ لگے تھے اس کی تیاری میں۔ اتفاق سے شادی کینسل ہوگئی تو یہ جوڑا یہاں ہی رہ گیا۔ اب جب دوبارہ شادی کی تاریخ مقرر ہوگی تو پھر نیا آرڈر دیا جائے گا۔'' دکاندار پوری تفصیل بتا رہا تھا۔

''چلو اس طرح ہمارا تو کام ہوگیا'' ثروت خوش تھی پھر اس نے اپنے لیے بھی وہاں سے خوب شاپنگ کی اور گھر فون کر کے عرشی اور آئمہ کو بھی من پسند سوٹ ملنے کی خوشخبری سنا دی۔

''پھر کب آ رہی ہیں۔'' عرشی پوچھ رہی تھی۔

''بس ایک دو دن میں۔'' ثروت نے جواب دیا۔ آنے سے پہلے انھوں نے دبئی کے دیدہ زیب شاپنگ مال سے شاپنگ میں دن بھر صرف کیا اور لدے پھندے پاکستان آ گئے۔

☆......☆......☆

شادی کے لیے جگہ منتخب کرنے، مختلف تقریبات کے لیے سجاوٹ، پکوان، مہمانوں کے استقبال، خاطر تواضع، دلہن کے لیے جیولری، پارلر، غرض کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں سوچ و بچار نہ کی گئی ہو۔ ثروت اور ایاز نے کئی شادی Planners کی خدمات لی ہوئی تھیں۔ تب کہیں جا کر وہ شادی بہ حسن وخوبی انجام پذیر ہوئی تھی۔ کئی دنوں تک شہر میں چرچا رہا تھا۔ چودھری عارف علی کے بڑے بیٹے چودھری ایاز کی شادی کا۔

☆......☆......☆

ولیمہ کے اگلے ہی دن نیا نویلا جوڑا ہنی مون کے لیے بیرون ملک نکل کھڑا ہوا۔ تقریباً بیس پچیس دن کے بعد دونوں کئی ممالک گھوم کر واپس آئے تھے۔ ممی نے دونوں کو پیار کیا ''کیسی ہو آئمہ؟'' انھوں نے محبت سے بہو کا حال پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' جواب میں روکھا سا جواب آیا۔

''کیا بات ہے۔ تمھارا کچھ موڈ ٹھیک نہیں، شاید تھکی ہوئی ہو۔''

جواب میں آئمہ خاموش رہی۔ ''تم دونوں فریش ہو جاؤ میں کھانا لگواتی ہوں۔''

''نہیں مجھے بھوک نہیں پلین میں لے لیا تھا۔'' آئمہ کا لہجہ اب بھی خشک تھا۔

''کیا بات ہے ایاز؟ تم نے تو آئمہ کو کچھ نہیں کہا۔'' اب کے ممی نے ایاز کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ایاز نے ایک نظر آئمہ کو دیکھا اور خاموشی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔

''یہ کیا بتائیں گے؟'' آئمہ تنک کر بولی۔

''تو تم ہی بتا دو بیٹا، ابھی تو تم دونوں کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ پھر اتنے دنوں کے بعد تم لوگ گھوم پھر کر اپنا ہنی مون منا کر آئے ہو یہ تم لوگوں نے اپنا موڈ کیوں خراب کیا ہوا ہے۔'' ممی کچھ پریشان ہو گئی تھیں۔

''میں نے ان سے کہا تھا کہ مجھے میری دوست سے بھی ملوا لائیں، لیکن یہ نہیں لے کر گئے۔ حالانکہ وہ میری اتنی کلوز فرینڈ ہے۔''

''تو کیا وہ شادی میں شریک نہیں ہوئی تھی۔'' ممی پوچھ رہی تھیں۔

''کہاں شرکت کر سکی بچوں کی طبیعت کی وجہ سے پاکستان نہ آ سکی۔ لیکن اب میں تو وہاں گئی تھی، لے جاتے، وہ بھی اتنا بلا رہی تھی لیکن ان کی تو ایک ہی نہ تھی۔'' آئمہ غصے میں تیز تیز بول رہی تھی۔

''کہاں رہتی ہے وہ؟''

''سنگاپور۔'' آئمہ نے جواب دیا۔

''ایاز، بیٹا جب تم سنگاپور گئے تھے تو وہاں بھی لے جاتے، آئمہ اپنی فرینڈ سے مل لیتی۔'' ممی رسان سے کہہ رہی تھیں۔

''ممی ہم سنگاپور نہیں گئے تھے۔ بنکاک میں تھے، وہاں سے محترمہ فرما رہی تھیں۔'' ایاز چڑ کر بولا۔

''ہاں تو کیا پرابلم تھا۔'' آئمہ، ایاز کو دیکھ کر بولی۔ ''لے جاتے ایک دو دن کے لیے۔''

''ممی پرابلم یہ تھا کہ بابا کے یہاں سے فون آ رہے تھے۔ ایک بہت ضروری بزنس ڈیلنگ تھی جو میں نے ہی کرنی تھی، اس سے میں نے کہا بھی ہے کہ اگلے مہینے لے جاؤں گا۔ اتنی جگہیں تو گھوم لیں، لیکن اس کا تو......'' ایاز غصہ میں کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''بیٹا، ایاز نے کہا تو ہے کہ اگلے مہینے لے جائے گا، چلو غصہ تھوکو۔'' اب ممی آئمہ سے کہہ رہی تھیں۔

''ہونہہ'' جواب میں آئمہ پیر پٹختی کمرے سے چلی گئی اور ممی خاموشی سے اس کی پشت دیکھتی رہ گئیں۔

''لے جاتے بیٹا، جہاں اتنی جگہیں گئے وہاں سنگاپور بھی اس کی دوست سے ملوانے لے جاتے، اب دیکھو کیسا موڈ خراب ہے اس کا۔'' ممی ایاز کی طرف رخ کر کے بولیں۔

''ممی آپ کو نہیں پتہ، اس لڑکی کی تو فرمائشیں ہی ختم نہیں ہوتیں، اس کی کہی ہر بات پوری کی ہے۔ پندرہ دن کا ٹور تھا، یہ دس دن جو اوپر ہوئے ہیں وہ بھی انہی کی وجہ سے اور اب بھی نہیں آنا چاہ رہی تھیں۔ تین سوٹ کیس تو صرف انہی کی شاپنگ سے بھرے ہیں۔ اب بھی بس نہیں چل رہا تھا کہ پورا شاپنگ مال خرید کر لے آئیں۔'' ایاز کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

''شروع شروع میں ہر لڑکی کا دل چاہتا ہے بیٹا، گھومنا پھرنا، شاپنگ، یہی تو دن ہوتے ہیں پھر تو بچوں کی ذمہ داری ہو جاتی ہے۔ ناسمجھ ہے نا، سمجھ جائے گی تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم غصہ تھوکو اور

دیکھو میرے خیال سے رشیدہ نے ٹیبل لگا دی ہے کچھ کھالو۔'' ممی ایاز کو نرمی سے سمجھا رہی تھیں۔

''مجھے بھوک نہیں۔'' ایاز نے کہتے ہوئے صوفے پر سے اپنا کوٹ اٹھایا اور کمرے سے نکل گیا۔ اور ممی ایک آہ بھر کر رہ گئیں۔

☆......☆......☆

آئمہ کمرے میں بیٹھی نیل پالش کے کلرز دیکھ رہی تھی کہ ایاز کمرے میں داخل ہوا اور صوفے پر ڈھے گیا۔ آئمہ انہماک سے اپنے شیڈز میں مگن رہی۔ کچھ لمحے یونہی سرک گئے۔

''آئمہ میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ مجھے گولی اور چائے دے دو۔'' ایاز سر دباتے ہوئے بولا۔

''اچھا!'' آئمہ نے لاپروائی سے کہا اور اپنے کام میں مصروف رہی۔

ایاز نے چند منٹ تو انتظار کیا پھر آنکھیں کھول کر آئمہ کو دیکھا۔

''میں نے تم سے کچھ کہا ہے آئمہ۔'' اب وہ قدرے زور سے بولا تھا۔

''افوہ'' اس کے چہرے کے نقوش بگڑے تھے۔ ''باہر سے آئے ہیں عاقل سے کہتے نہیں آئے؟ رخسانہ!'' اس نے ملازمہ کو آواز لگائی۔ چند لمحوں بعد ہی وہ حاضر تھی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ''ہاں رخسانہ، عاقل سے کہہ کر صاحب کے لیے چائے بنوا دو، فٹافٹ اور ساتھ سر درد کی گولی بھی لیتی آنا۔'' اس نے رخسانہ کو ہدایت دی۔

''لیکن چھوٹی بی بی، عاقل چاچا تو آج جلدی چلے گئے۔''

''او ہو تو وہ جو اُن کے ساتھ لڑکا ہوتا ہے، کیا نام ہے اس کا......'' اس نے چند لمحے سوچا لیکن نام یاد نہ آیا۔ ''اس سے کہہ دو اور ذرا جلدی۔''

''چھوٹی بی بی وہ دونوں ہی چلے گئے اب کچن میں رشیدہ باجی ہے اس سے کہہ دوں۔''

اس نے اجازت چاہی۔

''ہاں ہاں اُس سے......'' ابھی آئمہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایاز نے اس کی بات کاٹی۔

''نہیں اُس سے نہیں کہنا، وہ بہت بری چائے بناتی ہے بالکل ابلا ہوا پانی لگتا ہے۔ آئمہ پلیز تم چائے بنا دو۔'' ایاز نے رخسانہ کو منع کرتے ہوئے اگلا جملہ آئمہ سے کہا۔

''تو...... یہ رخسانہ چائے بنا دے گی۔ تم بنالیتی ہونا چاہئے؟'' آئمہ جلدی سے رخسانہ سے بولی۔

جواب میں رخسانہ سر ہلانے لگی۔

''میں نے تم سے کہا ہے آئمہ، تم چائے بنا دو۔''

ایاز اب چبا چبا کر آئمہ سے بولا تھا۔

''میں ...... میں بنا دوں؟ تو یہ نوکروں کی قطار گھر میں کس لیے رکھی ہے۔'' اب کے وہ بھی دوبدو بولی تھی۔

''رخسانہ تم جاؤ۔'' ایاز نے دروازے پر کھڑی رخسانہ کو مخاطب کیا تو وہ تیزی سے پلٹ گئی۔

''تم میرے لیے ایک کپ چائے کا نہیں بنا سکتیں میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے اور تم ہو کہ ابھی اس سے کہہ رہی ہو اور ابھی اُس سے، چائے بنانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔''

''میں آئمہ وقار، وقار محمود کی بیٹی، جس نے کبھی اپنے باپ کے گھر میں کچن کی شکل نہ دیکھی وہ یہاں چائے بنائے؟''

''تو کون سی قیامت آ جائے گی۔''

''قیامت ہی تو آ جائے گی، کیا میں یہاں، کام کرنے کے لیے آئی ہوں اگر ایسا ہی تھا تو کسی مڈل کلاس لڑکی سے شادی کرتے جو چائے بھی بناتی اور کھانا بھی پکاتی اور ساتھ میں روٹیاں بھی تھوپتی۔''

''تم خوامخواہ بات بڑھا رہی ہو اگر تم......'' ابھی ایاز نے اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

''کون ہے؟''

اور جواب میں ممی نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر دیکھا تھا۔

''اوہ ممی آپ، خیریت؟''

''کیا ہوا، کیا بات ہو گئی؟ تم دونوں کی آوازیں باہر تک آ رہی ہیں۔'' وہ دونوں کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

''یہ چاہتے ہیں کہ اب کچن کے کام بھی میں ہی کروں۔'' آئمہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''ہائیں، مگر بیٹا کچن میں عاقل اور غیاث تو ہوتے ہیں یہ آئمہ کیوں!!'' وہ حیرانی سے ایاز کو دیکھ رہی تھیں۔

''بیکار کی باتیں نہ کرو، ممی پلیز میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ مجھے ایک کپ چائے چاہیے۔'' وہ تقریباً بے بسی سے بولا تھا اور کمرے سے نکل گیا۔

ممی کچھ متحیر سی آئمہ کو دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئی تھیں۔ پھر انھوں نے رخسانہ کو آواز دے کر جب چائے کے لیے کہا تو اس سے ساری صورتحال معلوم ہوئی۔ وہ ہونٹ بھینچتی ہوئیں خود ہی کچن کی طرف چلی گئی تھیں۔ چائے بنا کر انھوں نے ایاز کو دی جو دوسرے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ اسے گولی دے کر وہ خاموشی سے باہر آ گئی تھیں۔ سوچ کی کئی لکیریں ان کے چہرے پر واضح تھیں۔

☆......☆......☆

''بیٹا یاد ہے نا آج بڑی پھپھو کے گھر جانا ہے۔'' ممی نے ناشتہ کرتے ایاز کو یاددہانی کروائی۔

''جی جی۔''

''کوئی میٹنگ وغیرہ تو نہیں ہے نا، رکھنا بھی نہیں اور شام میں جلد ہی آ جانا۔ تمھاری پھپھو بہت تاکید کر کے گئی تھیں۔'' ممی سلائس پر جیم لگاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ''یہ آئمہ نہیں آئی ابھی تک۔'' انھوں نے ایاز سے پوچھا۔

''آ رہی ہے، آپ فکر نہ کریں ہم لوگ ٹائم سے آ جائیں گے۔ بابا ناشتہ کر چکے؟''

''ہاں آج انھوں نے بس لائٹ سا ہی ناشتہ لیا۔ عرشی اور فاران تو دیر سے ہی کرتے ہیں۔'' ابھی ممی یہ کہہ ہی رہی تھیں کہ آئمہ ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی اور سلام کرتے ہوئے کرسی کھسکاتی ہوئی بیٹھ گئی۔

ممی نے سلام کا جواب دیا اور اس کی خیریت پوچھی۔ اور پھر اُسے بھی بڑی پھپھو کے ہاں جانے کی بابت یاددلایا۔

''آج پھپھو کے ہاں، خیریت؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''بھول گئیں بیٹا، آج ذیشان کی نکاح کی تقریب ہے۔''

''آج؟ لیکن شادی تو......'' وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں شادی تو ابھی پندرہ دن بعد ہے لیکن آج نکاح کی تقریب کر رہے ہیں۔''

''تو نکاح بھی جب ہی کر لیتے۔ اتنے دن پہلے کیوں کر رہے ہیں۔'' آئمہ نے جوس کے گھونٹ بھرتے ہوئے اعتراض کیا۔

''یہ اُن کی مرضی، تم کیوں معترض ہو۔'' اب کے ایاز نے اس کے اعتراض کا جواب دیا۔

''اوکے، وہ پہلے کریں یا بعد میں، بہرحال

میری طرف سے تو سوری، کیونکہ آج میری بڑی عزیز دوست کی مہندی ہے مجھے وہاں جانا ہے۔'' وہ لا پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

''کون سی دوست کی۔'' ایاز نے ابرو چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''منیبہ کی۔''

''سوری تم منیبہ سے کرو، ذیشان کے نکاح کی پارٹی زیادہ اہم ہے، ورنہ پھپھو کیا سوچیں گی۔''

''اور میری فرینڈ جو مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ آپ کو معلوم ہے میری شادی میں وہ میرے گھر پورا ہفتہ رہی تھی اور میں اس کی مہندی میں نہ جاؤں، امپوسیبل، سب سے زیادہ مہندی ہی تو اہم تقریب ہوتی ہے۔ ہلا گلا، شور شرابہ، سب فرینڈز آئے ہوں گے، آپ پھپھو سے میری طرف سے ایکسکیوز کر لیجیے گا۔''

''میں پھپھو سے ایکسکیوز کر لوں، تم منیبہ سے ایکسکیوز نہیں کر سکتیں؟ پھپھو کے ہاں نکاح ہے جبکہ منیبہ کی مہندی، پھپھو کے گھر سارا خاندان جمع ہوگا اور ہماری شادی کے بعد یہ ہمارے خاندان کی پہلی تقریب ہے سب تم کو پوچھیں گے۔ ہم کس کو جواب دیتے پھریں گے۔'' ایاز کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

''یہ میرا مسئلہ نہیں۔'' اس کی لاپروائی میں فرق نہیں آیا تھا۔

''تم آخر اپنی ذات سے ہٹ کر کیوں نہیں سوچتیں، تمھارا پرابلم تو سارے گھر کا پرابلم بن جائے لیکن ہمارا مسئلہ......''

''ایاز، ایاز، کول ڈاؤن بیٹا، اتنا ہائپر ہونے کی ضرورت نہیں۔ آئمہ تم ایسا کر لو کہ دن میں تھوڑی دیر کے لیے اپنی دوست کے ہاں چلی جاؤ پھر جب ہم تمھاری پھپھو کے ہاں جائیں گے تو ایاز تم کو پک کر لے گا یا ڈرائیور کے ساتھ آ جانا۔ اس طرح تم دونوں جگہ شریک ہو جاؤ گی۔'' ممی نے مسئلہ کا حل نکالا۔

''کیوں ایاز بیٹا ایسا کر لیں اس طرح نہ اس کی دوست کو شکایت ہو گی نہ پھپھو کو۔''

''اوکے'' ایاز نے چند لمحے سوچا اور پھر سر ہلا دیا۔

''پہلے مجھ سے تو پوچھ لیں کہ مجھے بھی یہ مشورہ قبول ہے یا نہیں۔'' آئمہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔

''کیوں اب کیا قباحت ہے۔'' ایاز نے اس کی طرف گردن موڑی۔

''قباحت یہ ہے کہ جب سارے مہمان اور فرینڈز آ ئیں گے اور اصل پارٹی جس وقت شروع ہوگی اس وقت میں وہاں سے آ جاؤں تو پھر فائدہ ہی کیا میرے وہاں جانے کا، اکیلی مل کر آ جاؤں؟ سوری میں جاؤں گی تو رات میں ہی، دن میں نہیں جاؤں گی۔'' اس نے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

''تو پھر تم منیبہ کے ہاں جاؤ گی ہی نہیں نہ دو پہر میں نہ رات میں ...... سمجھیں۔'' ایاز تیز آواز میں بولا تھا۔

''ایاز کیا ہو گیا بیٹا، ملازم ......'' ابھی ممی کہہ ہی رہی تھیں کہ آئمہ اس سے زیادہ تیز لہجے میں بولی۔

''میں جاؤں گی اور ہر صورت میں جاؤں گی، کون مجھے روکتا ہے۔''

''تم میری اجازت کے بغیر نہیں جا سکتی۔''

''خام خیالی ہے آپ کی۔'' وہ طنزیہ ہنسی تھی اور اس کی ہنسی سے ایاز کو تو گویا آگ ہی لگ گئی تھی۔ دونوں ہی جلد غصہ میں آ جاتے تھے جس سے پھر بات بڑھتی چلی جاتی۔

''اگر تم جاؤ گی تو پھر واپس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ایاز تقریباً چیخا تھا۔

''تو میں کون سی یہاں رہنے کے لیے مری جا رہی ہوں۔'' وہ بھی اس کی ہم آواز تھی۔ پھر اس نے ہاتھ میں پکڑا ملک شیک کا گلاس ٹیبل پر پٹخا اور کرسی زور سے دھکیلتی ہوئی ہال سے نکل گئی۔ دوسری طرف ایاز غصہ سے بے قابو ہو رہا تھا۔

''آپ دیکھ رہی ہیں۔ یہ پہلے دن سے اسی طرح کر رہی ہے، میری کوئی بات نہیں سنتی۔''

''آرام سے بیٹا، تم بھی تو......''

''آپ مجھے سمجھاتی ہیں اسے کیوں نہیں کچھ کہتیں۔'' وہ ممی کی بات کاٹ کر برہمی سے بولا۔

''کیونکہ بیٹا، میرا بس تو تم پر ہی ہے، وہ ابھی نئی ہے آہستہ آہستہ......''

''آپ یہی کہتی رہیں، دو مہینہ ہو گئے ہیں لیکن اس کے مزاج نہیں بدلے۔''

''ہاں تو صرف دو مہینہ ہی تو ہوئے ہیں اتنے مختصر عرصہ میں کوئی کیا سمجھے گا۔''

''لیکن مجھے نہیں لگتا یہ کبھی سمجھے گی۔'' ایاز نے اتنا کہہ کر نیپکن سے منہ صاف کیا اور نیپکن کو ٹیبل پر پھینک کر غصے سے نکل گیا۔ ممی ہاتھوں میں سر تھام کر رہ گئیں۔

اور پھر آئمہ نے اپنی مرضی ہی چلائی وہ ڈرائیور کے ساتھ شام کو ہی، ایاز کے آنے سے پہلے ہی منیبہ کے ہاں چلی گئی اور جاتے ہوئے ممی سے کہہ گئی کہ وہ اُسے بلوانے کی زحمت نہ کریں۔ ممی نے ایک دفعہ پھر اسے خاندانی نزاکت کا احساس دلانے کی کوشش کی ان کی یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی۔

شام کو جب ایاز گھر آیا تو آئمہ کو نہ پا کر سیخ پا ہو گیا۔ ممی نے اور بابا نے اگرچہ اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے کمرے میں جا کر موبائل پر آئمہ کو سخت کھری کھری سنا دی تھیں اور سختی سے اُسے واپس نہ آنے کی دھمکی دی۔

ممی اس کے پیچھے پیچھے آئی تھیں۔ ''کیا ہوا بیٹا، اس بات کو اتنا بڑا ایشو نہ بناؤ۔''

''میں نے آئمہ کو وارننگ دے دی ہے یا تو پھپھو کے ہاں چلے ورنہ پھر اپنے باپ کے گھر بیٹھی رہے۔'' ایاز مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔

''تم کیوں چھوٹی سی بات کو اتنا بڑا بنا رہے ہو۔ میں کوئی بھی بہانہ کر دوں گی۔''

''اب بات میری انا کا مسئلہ بن چکی ہے اور آپ کو کسی قسم کے بہانے یا غلط بیانی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ایاز تم کو کیا ہو گیا ہے۔'' مگر ایاز کسی کی نہ سن رہا تھا۔ دوسری طرف آئمہ نے بھی ضدی طبیعت پائی تھی۔ دوست کی شادی، ولیمہ اُس نے ماں کے گھر سے ہی اٹینڈ کیا تھا۔ تین چار دن کے بعد ممی نے آئمہ کو فون کیا یہ سوچ کر کہ معاملہ ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔ آئمہ کا غصہ بھی اتر گیا ہو گا اور وہ اُسے گھر بلانے کا کہیں گی لیکن وہاں تو ایک نیا ہی قصہ کھڑا ہو گیا تھا۔ فون ملازمہ نے اٹھایا تھا کیونکہ آئمہ کا سیل آف تھا۔ او پھر دوسری طرف آئمہ کے بجائے اس کی ماما تھیں۔ سلام دعا کے بعد جب ممی نے آئمہ سے بات کرنا چاہی تو انھوں نے صاف گوئی سے کہا۔

''کیوں اب کیوں بات کرنا چاہ رہی ہیں آپ کے بیٹے نے خود ہی تو اسے گھر سے نکالا ہے۔''

''ارے بھابھی کیا کہہ رہی ہیں ہم کیوں خدانخواستہ آئمہ بیٹی کو گھر سے نکالیں گے۔''

''بیٹی بھی کہہ رہی ہیں اور پھر اپنے بیٹے کو سمجھاتی بھی نہیں۔ میری بیٹی اتنی گری پڑی نہیں ہے۔'' ماما کا لہجہ کچھ جتاتا ہوا تھا۔

''دیکھیں بھابھی میں نے تو دونوں ہی کو

سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن دونوں نے بچگانہ سوچ دکھائی، بہرحال میں ڈرائیور کو بھیج رہی ہوں آپ آئمہ سے کہیں تیار ہو جائے۔'' ممی نے بات ختم کرنا چاہی۔

''میری بیٹی اب ایسے ہی نہیں آجائے گی۔ ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور آپ لوگوں نے ابھی سے اس کے ساتھ زیادتیاں کرنی شروع کر دیں۔ ایاز کا رویہ الگ اُس کے ساتھ اتنا برا ہے۔''

''مگر ہم نے تو کوئی زیادتی نہیں کی۔ جہاں دل چاہے آئے جائے، جو چاہے کرے، اس پر کوئی روک ٹوک نہیں۔'' ممی حیرانگی سے کہہ رہی تھیں۔

''بس بس رہنے دیں، آئمہ نے مجھے خود بتایا ہے کہ آپ لوگ اس سے کچن کے کام بھی کہتے ہیں۔ غضب خدا کا جس لڑکی نے ساری زندگی ہل کر پانی بھی خود نہ پیا ہو وہ کیسے کچن میں جا کر کام کرے گی۔''

''نہیں نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ایسا کچھ نہیں ہے۔'' ممی وضاحت کرنا چاہ رہی تھیں۔

''بس رہنے دیں ہر وقت اپنی مرضی اس پر تھوپنا، یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، یہاں نہ جاؤ...... اس کو اس طرح رہنے کی عادت نہیں ہے اپنے باپ کے گھر تو اس نے بے فکری اور آرام ہی دیکھا ہے۔ میں نے کبھی اُس پر پابندی نہیں لگائی۔'' آئمہ کی ماما نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ ممی تو بس حیرانی سے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔

''مگر ہم کیوں اُسے کاموں کے لیے کہیں گے جبکہ خود ہمارے گھر نوکروں کی تعداد، گھر والوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ پھر نہ میں نے اور نہ ہی ایاز نے کبھی اُس پر کسی قسم کی پابندی لگائی۔ آپ آئمہ کو بلائیں میں اسے سمجھاتی ہوں۔''

''بس اب سمجھنے سمجھانے کا وقت گزر چکا، بہت ہو چکا اب تو آئمہ کے ڈیڈی ہی بھائی صاحب سے بات کریں گے۔'' انھوں نے دوٹوک لہجہ اختیار کیا اور ممی یہ سن کر برداشت نہ کر سکیں۔

''ٹھیک ہے ایسا ہے تو یونہی سہی، جب ہماری کوئی غلطی ہی نہیں ہے تو پھر آپ سے کس بات کی صفائی پیش کروں۔''

اور پھر بات بڑھتی ہی چلی گئی۔ ایاز تو یہ سب سن کر مزید غصے میں بھر گیا۔ اس کا دل بھی آئمہ کی طرف سے کھٹا ہو چکا تھا یہ دو مہینے صرف لڑتے بھڑتے ہی گزرے تھے۔ آئمہ جیسی خود پسند لڑکی جو اپنے آگے کسی کو اہمیت نہ دیتی پھر اُسے اپنے والدین کی ناجائز سپورٹ بھی

حاصل تھی۔ اگرچہ ایاز کے گھر والوں نے معاملے کو سلجھانے کی بہت کوشش کی لیکن دوسرا فریق بات سلجھانے کے بجائے مزید الجھانے میں دلچسپی رکھتا تھا اور معاملہ ابھی بیچ میں ہی لٹک رہا تھا کہ ایاز نے بابا کے ہاتھ میں ایک لفافہ پکڑا دیا۔

''یہ کیا ہے'' بابا نے سوالیہ نظروں سے لفافہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں وکیل کے پاس گیا تھا۔''

''وکیل کے پاس؟ کیا مطلب؟'' ممی نے بھی نا سمجھی سے اُسے دیکھا۔

''یہ ڈیوورس پیپر ہیں آپ آئمہ کے گھر بھجوا دیں۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا اور کرسی پر گر سا گیا۔

''کک ...... کیا کہہ رہے ہو، ایاز تم ہوش میں ہو ......'' ممی کی آواز بند ہو گئی تھی۔

''جی ممی، میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ آج نہیں تو کل یہ ہونا ہی تھا۔ میں نے بہت چاہا کہ ایسا نہ ہو لیکن پھر مجبوراً مجھے یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔''

وہ تھکے تھکے لہجے میں کہہ رہا تھا اور بابا وہ بھی خاموشی سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ پیپرز آئمہ کے گھر بھجوا دیے گئے۔ ممی سمجھ رہی تھیں کہ شاید اب وہاں سے پھر کوئی بات اٹھے گی لیکن وہاں بھی سکوت طاری ہو گیا تھا شاید انھوں نے بھی اس فیصلے کو قبول کر لیا تھا۔

اور ممی سوچ رہی تھیں وہ شادی جس کے لیے کئی مہینوں تک انھوں نے تیاری کی تھی، کتنے ارمانوں سے جس کی شاپنگ کے لیے وہ شہر شہر گھومی تھیں، اس شادی کا حاصل یہ ہونا تھا!

وہ مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی ایاز کے بیڈ روم میں پہنچیں۔ وہ جلدی میں تیار ہو کر آفس کے لیے نکلا تھا۔ تولیہ اور کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ وارڈ روب کے کھلے دروازے بند کرتے کرتے ان کی نگاہ آئمہ کے ڈھیروں ہینگرز پر پڑی جنھیں اب بھجوانا تھا۔ انہی میں اس کا عروسی جوڑا بھی تھا ...... جس کی تلاش میں وہ اور ثروت دبئی تک گئے تھے اور جس کی قیمت انھوں نے منہ مانگی ادا کی تھی۔ صرف چند گھنٹوں کے لیے ستر لاکھ کا جوڑا خریدا گیا تھا۔ جس کا مقصد صرف دیکھنے والوں کی ستائش تھی۔ ان کی آنکھوں میں تعریف و توصیف اور مرعوبیت دیکھنا تھی ...... مگر جو اس شادی کو ستر دن بھی چلانے کی ضمانت نہ دے سکا تھا!

☆......☆......☆

مہرباں کیسے کیسے

دروازے کی گھنٹی متواتر بجے جا رہی تھی۔ بابا کی متوقع ناراضگی کا سوچتے ہوئے میں نے جلدی جلدی وضو ختم کیا اور پھر کمرے کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ دروازہ کھلنے اور پرزور سلام کی آواز سنائی دی۔ بابا کی چہکتی ہوئی آواز نے بخوبی آنے والوں کا تعارف کروا دیا تھا سو میں نے بہت اطمینان سے نماز پڑھنے کا سوچا۔ حسبِ توقع اور حسبِ معمول وہ جملہ میری سماعت سے ٹکرایا جو سارہ کی آمد پر اکثر مجھے سننے کو ملتا ہے۔ نماز ختم کر کے میں کمرے سے نکلی۔ سارہ سے ملنے کے بعد میں نے باورچی خانے کا رُخ کیا تا کہ چائے کے ساتھ کچھ اہتمام کر سکوں۔ میرے پیچھے پیچھے سارہ بھی باورچی خانے میں آ گئی اور میرے منع کرنے کے باوجود ٹرالی میں سامان وغیرہ سیٹ کرنے میں میرا ہاتھ بٹانے لگی۔

مجھے اپنی یہ نند بے حد عزیز ہے۔ صرف مجھے ہی کیا ''کاشانۂ فاروقی'' میں سب کو ہی سارہ بے حد عزیز ہے۔ میں جب اس گھر میں آئی تو سارہ یوسف بھائی کے ساتھ اس گھر سے رُخصت ہو چکی تھی مگر میں جان گئی کہ سارہ دونوں بھائیوں کی لاڈلی بہن ہے۔ امی اور بابا تو ''کھلاؤ سونے کا نوالہ، دیکھو شیر کی نگاہ سے'' کی پالیسی اپنائے رہتے ہیں مگر دونوں بھائی اس کے لاڈ اُٹھانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ وہ ہے ہی ایسی۔ اب اسے نازک مزاج کہوں یا حساس۔ کبھی میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا تھا مگر اب نہیں۔ وہ نازک مزاج نہیں ہے بلکہ حساس ہے۔ اُس نے بڑی بہن کی کمی مجھ سے پوری کرنی چاہی۔ مجھے اُس نے بڑی بہن والا احترام اور محبت دی تو اب وہ مجھے چھوٹی بہنوں کی طرح ہی عزیز ہے۔ اب جبکہ وہ ایک عدد بیٹے کی امی جان بن چکی ہے مگر اب بھی وہ وہی سارہ ہے کی چھوٹی سی بات پر جس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔

☆......☆......☆

''بھابھی۔ بھابھی! کہاں ہیں آپ؟'' سارہ زور زور سے آوازیں دیتے ہوئے کمرے کی طرف ہی آ رہی تھی۔

''یہاں ہوں بھئی'' میں نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔''جلدی آئیں ناں۔سلویٰ کو اس کے کمرے تک پہنچانا ہے اور احمد کی جیب بھی تو ہلکی کروانی ہے۔وہاں آپ کا ہی انتظار ہورہا ہے۔''

ہم ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سلویٰ کو رُخصت کرا کے لائے تھے۔مجھے اس گھر میں آئے ہوئے تین سال ہوگئے ہیں کہ اب ایک نئی بہو کا اضافہ ہوا ہے۔سارہ کی خوشی دیدنی تھی۔سچ بتاؤں آپ کو تو دو تین مرتبہ میرا دل چاہا کہ سارہ سے پوچھوں سارہ! کیا تم میری شادی پہ بھی اتنا ہی خوش تھیں؟؟ مگر میں یہ سوال سارہ سے نہ کر سکی۔

ہم دونوں سلویٰ کے پاس جا ہی رہے تھے کہ جاتے جاتے سارہ ایک دم رُکی۔

''بھابھی! آپ کی اور اسجد بھائی کی شادی پر میں اس سے بھی زیادہ خوش تھی۔میرے سب سے بڑے بھائی کی شادی تھی ناں!''۔

سارہ تو یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی مگر میں حقیقتاً گُم سُم کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔مجھے بہت حیرت تھی سارہ پر۔مگر وہ ایسی ہی ہے۔اب اُسے دل کا حال تو معلوم نہیں ہوتا تھا مگر وہ ہر ایک کے احساسات کا پورا خیال رکھتی ہے۔''ہر ایک'' پر شاید آپ قارئین کو اعتراض ہو مگر جو لڑکی اپنی بھابھی کے احساسات کا خیال رکھتی ہو وہ اپنے گھر والوں اور دوسرے لوگوں کا خیال کیوں نہیں رکھے گی۔بس اسی بات پر میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ وہ ہر ایک کے احساسات کا خیال رکھتی ہے۔یہ شاید اس لئے ہے کہ وہ خود بے حد حساس ہے۔جو توقع وہ خود دوسروں سے رکھتی ہے اُن توقعات کو وہ پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔پتا نہیں آپ میری بات سمجھ سکے ہیں یا نہیں۔بہرحال۔میں دو تین واقعات آپ کو اور سُناتی ہوں شاید آپ میری بات سمجھ سکیں گے۔

سلویٰ کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں زیور کا ایک سیٹ جیولر کو بننے کے لئے دینا تھا۔سارہ بس جمعرات کو ہی جا سکتی تھی اور اتفاق سے اس دن میری بیٹی کے اسکول میں فنکشن تھا تو میں نہیں جا سکتی تھی۔میں نے سوچ لیا تھا کہ امی اور سارہ ڈیزائن پسند کر کے سیٹ بننے کے لئے دے آئیں گی اور جب سیٹ بن کر آجائے گا تو میں دیکھ لوں گی۔میں اپنی بیٹی کے اسکول چلی گئی۔وہاں سے واپس آکر میں نے امی سے حال احوال پوچھا تو مجھے یہ سُن کر دھچکا لگا کہ سارہ نے امی کو

جانے سے منع کر دیا تھا۔ سارہ نے امی سے کہا تھا کہ ''آپ بھابھی کے ساتھ جا کر سیٹ دے آیئے گا اور جب بن کر آجائے گا تو میں دیکھ لوں گی۔''

''ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں مان ہی نہیں سکتی۔'' میری چھوٹی بہن افشین شدومد سے میری بات پر یقین کرنے سے انکار کر رہی تھی۔

''تو مت کرو یقین۔ جو حقیقت ہے وہ میں نے تم کو بتا دی ہے''۔ میں نے چڑ کر اپنی بہن سے کہا۔

''دیکھو نا باجی! ایسے کیسے ہو سکتا ہے آنٹی اپنے چھوٹے بیٹے کے لئے لڑکی دیکھنے جائیں اور سارہ باجی کی بجائے آپ کو لے جائیں۔ آپ تو بہو ہیں۔ بیٹی کے بجائے آپ کو لے کر جانا۔۔۔ ناقابلِ یقین!!'' وہ حیرت زدہ تھی۔

''افشین! واقعہ یہی ہے جو میں نے تم کو بتایا ہے۔ امی پھپھو کو لے کر جا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ گاڑی میں صرف ایک فرد کی گنجائش تھی سو سارہ نے بہت اصرار کر کے مجھے بھیج دیا۔ سلویٰ کو سارہ سے پہلے دیکھا بھی میں نے تھا۔ سارہ تو اس کے تقریباً ایک ماہ بعد گئی تھی اور وہ بھی منگنی کی انگوٹھی پہنانے''۔

میں نے اپنی بات ختم کر دی تھی مگر افشین ابھی تک سارہ کے بارے میں بے یقینی کا شکار تھی۔ اب میں اسے کیسے سمجھاتی کہ وہ ہے ہی ایسی۔

☆......☆......☆

سارہ تیز دواؤں کے زیرِ اثر تھی۔ ڈاکٹرز اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو رہے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ گھر والوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کر دیں۔ یہی وجہ تھی کہ آج یوسف بھائی کو ڈاکٹر نے بُلوایا تھا۔

''یوسف صاحب! آپ کی مِسز اپنی بیماری سے بالکل نہیں لڑ رہی ہیں۔ ہم نے اپنی طرف سے بھرپور کوششیں کر لی ہیں۔ اب تو صرف بہت دُعاؤں کی ہی ضرورت ہے۔ کوئی معجزہ ہی اُنہیں زندگی کی طرف لوٹا سکتا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے وہ خود بھی صحتیاب نہیں ہونا چاہتیں۔ اب اُنہیں ہسپتال میں رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ انہیں گھر لے جائیں۔ باقی دوائیں وغیرہ تو گھر پر بھی دی جا سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ گھر جا کر اُن کی حالت میں بہتری آجائے۔''

یوسف بھائی کو نڈھال قدموں سے ڈاکٹر کے کمرے سے باہر آتے دیکھ کر میں اندازہ لگا سکتی ہوں

کہ ڈاکٹر نے کیا کہا ہوگا۔ یوسف بھائی کے پیچھے پیچھے میں بھی سارہ کے کمرے کی طرف چلدی تا کہ سامان سمیٹ سکوں اور یوسف بھائی مختلف کارروائیوں کے لئے روانہ ہوگئے تا کہ سارہ کو گھر لے جایا جاسکے۔

سارہ کو گھر شفٹ کر دیا گیا۔ اس کے کمرے میں اس کی دوائیاں سیٹ کرتے ہوئے میں مستقل اسی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ کیا وجہ تھی جو ہنستی مسکراتی سارہ یوں بے سُدھ بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ میں شاید اس گتھی کو ہرگز نہیں سلجھا پاتی اگر اتفاقاً اسکی دونندوں کی وہ گفتگو نہ سن لیتی۔

''تم کیا سوچ رہی ہو؟'' مجھے ایمن کی آواز آئی تھی وہ غالباً عالیہ آپا سے پوچھ رہی تھی کیونکہ اس کے بعد مجھے عالیہ آپا کی آواز ہی سنائی دی تھی۔

''نہیں کچھ نہیں۔ بس۔ پچھتاوے کا احساس ہو رہا ہے۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ سارہ بہت حساس ہے لیکن میں نے بہت سی ایسی باتیں کی ہیں جو یقیناً دنیا کی نظر میں تو بہت غیر اہم ہوں گی لیکن مجھے یقین ہے کہ سارہ نے اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے انہیں بہت زیادہ محسوس کیا ہوگا۔ بہت دفعہ ایسا ہوا کہ وہ صحیح بات کر رہی ہوتی تھی مگر میں اسے نظرانداز کر جاتی تھی۔ اس نے جب بھی مجھ سے کچھ پوچھنا چاہا، میں نے بہت بے رخی سے اسے جواب دیا۔ مجھے اندازہ ہے شادی کے سات سال بعد بھی وہ مجھ سے بے تکلف نہیں ہو سکی۔ اور یہ صرف میرے رویے کی وجہ سے ہی ہوا۔ مجھے ابھی دو ماہ پہلے ہی معلوم ہوا کہ میں جو محض بدگمانی کی وجہ سے سارہ سے کھنچی کھنچی رہتی تھی وہ محض میری غلط فہمی تھی۔ راشدہ نے سارہ کی طرف سے وہ بات مجھ تک پہنچائی تھی جو سارہ نے کسی سے کہی ہی نہیں تھی۔ راشدہ سارہ سے کوئی بدلہ لینا چاہتی تھی تو اس نے مجھے ذریعہ بنایا اور دیکھو اس کے جال میں پھنس کر میں سارہ سے اپنے تعلق خراب کر بیٹھی۔ ابھی کل ہی یوسف مجھے بتا رہا تھا کہ اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے سارہ ہر کسی کی بات کو بہت زیادہ محسوس کرتی تھی مگر آفرین ہے اس پر کہ اس نے کبھی اپنے عمل سے اس کا اظہار نہیں کیا۔''

وہ پل بھر کو رکیں ''اب جبکہ ڈاکٹر اس کی طرف سے مایوس ہو رہے ہیں تو مجھے ایک ایک بات یاد آ رہی ہے۔ اس نے جب بھی مجھے کوئی تحفہ دیا میں نے کبھی اس کی تعریف میں ایک جملہ بھی نہیں کہا حالانکہ اس کی پسند بہت اچھی ہوتی تھی۔ جبران کے میٹرک کے

رزلٹ پر اس نے مجھے سوٹ دیا تو میں نے اس سے سوٹ تو لے لیا لیکن ساتھ ہی یہ جملہ بھی کہہ دیا کہ یہ تو رسم ہے مجھے دینے کی کیا ضرورت۔ اور ایمن! اس سے بڑھ کر میں نے یہ ظلم کیا کہ وہ سوٹ اپنی کام والی کو دے دیا۔ میں غصے میں یہ بھی نہیں سوچ سکی کہ پیسے تو یوسف کے خرچ ہوئے ہوں گے اور اسے معلوم ہوگا تو کتنا دکھ ہوگا۔ اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ اس نے پچھلے تین سالوں سے براہِ راست مجھے کبھی کچھ نہیں دیا۔ بلکہ یوسف سے ہی دلوایا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے اپنی زبان سے نہ اظہار کیا ہو لیکن سارہ کو میں نے وہ مقام اور محبت نہیں دی جو اس کا حق تھا۔ میں کیسے سارہ سے معافی مانگوں۔ پتا نہیں اللہ مجھے معاف کرے گا یا نہیں۔''

عالیہ آپا کے آخری جملے میں صحیح سے سمجھ ہی نہیں سکی کیونکہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ انہوں نے نادانستہ ہی سہی اپنے عمل سے ایک محبت بھرے حساس دل کو کرچی کرچی کر دیا تھا۔ شاید وہ اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتی تھیں۔

☆......☆......☆

میں اس دن اپنے گھر جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ میں دو دن سے سارہ کے پاس تھی۔ اب گھر جا کر پھر دوبارہ آنے کا ارادہ تھا۔ یوسف بھائی نے مجھے گاڑی کا انتظار کرنے کا کہا تھا۔ میں سارہ کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ سارہ کا سر دہاتھ میں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ایمن اور عالیہ آپا بھی اس کے قریب ہی کھڑی تھیں۔ مجھے ان کی گفتگو کا خیال آیا جو میں کل اتفاقاً سن چکی تھی۔ میں نے اس گفتگو کی بابت بات شروع کر دی۔ ان دونوں کی باتوں سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے کئے پر پشیمان ہیں۔ میں نے سارہ کے ہاتھوں کی ہلکی سی جنبش کو فوراً محسوس کیا تھا۔ وہی لمحات تھے جب وہ ہوش کی دنیا میں واپس آئی تھی۔

سارہ نے آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ ان کے گرتے آنسوؤں کو دیکھ رہی تھی۔ ان کی آوازیں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ مگر یہ سب شاید اس کے لئے بہت ہی غیر متوقع تھا۔ اس کا دل اس خوشی کو سنبھال ہی نہ سکا اور لمحہ بہ لمحہ سارہ کے دل کی دھڑکن دینے والی مشین کی اسکرین پر نمودار ہونے والی ایک سیدھی لائن نے یہ بتا دیا تھا کہ ایمن اور عالیہ آپا کے منہ سے نکلنے والے جملوں کو سننے والا اب کوئی نہ تھا۔ اس اعتراف کی اب کوئی حاجت، کوئی ضرورت نہ رہی تھی! وہ ندامت کے چند موتی ہی سمیٹ کر جا چکی تھیں۔

☆☆☆

دوسری قسط

نصرت یوسف

مونالیزا

رنگ، خوشبو اور جگنو......دل میں پنپنے بھی لگے تو کس کے لیے......اس لمحے کی کہانی جب دل تاویلات سے بے نیاز ہو جاتا ہے

اسکو محض کھڑا دیکھ کر سارا کے چہرے پر ناگوار تاثرا بھرا۔ وہ مستقل اس بچی کو جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''آخر آپ کو کیا تکلیف ہے اگر یہ یہاں سو رہی ہے؟'' احمر نے اس کی لاحاصل جدوجہد دیکھ کر حیرت ظاہر کی۔

اب کے اس نے احمر کو خاصی تیکھی نظر سے دیکھا'' کچھ بھی اس کے ساتھ بیت جائے گا، کسی کو خبر نہ ہوگی، کیا آپ بچوں کے ساتھ ہونے والی سفاک حرکتوں کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتے؟''

اس کے الفاظ نے احمر کو کسی حد تک شرمندہ ضرور کر دیا تھا تب ہی اس نے آگے بڑھ کر سارا کی مدد کر ہی دی۔ دونوں اسکو چلاتے ہوئے اسٹور کے روشن حصے کی جانب لے آئے، مین روڈ کے ساتھ ہی فٹ پاتھ پر درخت کے سہارے بٹھاتے ہوئے احمر نے اس گلے پڑنے والی نیکی کا دورانیہ ختم ہونے پر دل ہی دل میں شکر ادا کیا اور اپنے بارے میں اردگرد لوگوں کا خیالی تاثر اسے کوفت میں مبتلا کرنے لگا۔ وہ لڑکی سارا بھی عجیب ہی تھی۔ محض ایک لفظ شکریہ کا کہہ کر احمر سے اتنی بے نیاز ہوگئی تھی جیسے کچھ خاص ہوا نہ ہو۔ اب وہ اس بچی کی طرح کی میلی کچیلی سی عورت کو کچھ کہہ رہی تھی جو غالباً اس کے والی وارثوں میں سے کوئی تھی اور اچانک کہیں سے نمودار ہوگئی تھی۔ ایک چھوٹا سا بچہ اس کی گود میں ٹنگا تھا۔

''بلاضرورت بچے ہونگے تو یہ ہی ہوگا، ایک آدھ ادھر ادھر ضائع بھی ہو جائے گا تو کیا فکر۔'' بے رحمانہ سا تجزیہ کرتے ہوئے احمر نے اسٹور کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ اپنی مطلوبہ خریداری سے فارغ ہو کر وہ گھر پہنچا تو پھوپھو کی فیملی آئی ہوئی تھی۔ مہمانوں کے ساتھ خوش گپیوں میں لگ کر اسے پچھلا کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ رات سونے کیلئے لیٹتے وقت اسٹور کے باہر بیتا واقعہ اسے پھر یاد آ گیا۔ احمر کو حیرت تھی کہ سارا عقبی گلی میں کیسے اور کیوں پہنچی تھی۔ بینچ پر صرف ان گاڑیوں کی روشنی تھوڑی بہت پہنچ رہی تھی جو اس گلی کے قریب تھیں۔ اس نے اس پر سوچنے میں زیادہ دماغ نہ لگایا

اور سو گیا۔ صبح جب وہ سو کر اٹھا تو رات دیکھے خواب نے اس کے اندر خاموشی سی پیدا کر دی تھی۔ جہاں سارا تھی اس کی نم آنکھیں اور شفاف سیدھی مانگ کے ساتھ بنے اس کے سیاہ کالے بال، ان آنکھوں میں جیسے کوئی درخواست تھی اور ان بالوں کے درمیان نظر آتے سیدھے خط میں کوئی سحر۔ احمر جیسے ان میں جکڑا گیا تھا۔

دن کے آغاز کے ساتھ ہی اس پر یہ انکشاف ہو چکا تھا کہ دل نے سارا کو سنڈریلا مان لیا ہے۔

یہ دریافت نا قابل یقین ہی تھی۔ ایک مصور کی تصویر کے طور پر اس کو سراہنا اور بات تھی اور اپنی سنڈریلا بنانا بالکل مختلف بات۔ ایک اسٹور پر سیلز گرل، جس میں جنگلی پھول کی سی خوشنمائی تو تھی لیکن قیمتی گلدان میں لگے پھول کی سی لطافت نہیں۔ مگر پھر بھی احمر کی نگاہ اس پر رکی ضرور تھی۔ وہ ہجوم میں مل کر بھی الگ لگتی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کو دیکھتے ہی پینٹنگ مونا لیزا کا خیال آتا تھا یا شاید اس لیے کہ اس کی آواز میں نغمگی اور ملائمت جیسے رچی تھی یا شاید اس لیے کہ وہ گہری رنگت کی ہونے کے باوجود روشن لگتی تھی۔ جیسے اس کے اندر سے شعاعیں نکلتی ہوں، جو بھی تھا بہر حال وہ احمر کو اپنی جانب بنا کسی پذیرائی کے متوجہ کر لیا کرتی تھی۔ دیکھنے اور لطف اندوزی کی حد تک معاملہ رہتا تو ٹھیک تھا مگر اپنے ساتھ جوڑ لینے کی گنجائش نہیں تھی۔ جبکہ دل تھا کہ ان سب تاویلات سے بے نیاز اپنی ہی کہانی سنا رہا تھا اور احمر کو دہلا رہا تھا۔ اس نے اسی لمحہ فیصلہ کر لیا کہ وہ آئندہ اس اسٹور پر شاپنگ کچھ عرصہ کے لیے ترک کر دے گا تا کہ اس خودرو جھاڑی کو نمو پانے کا موقع ہی نہ ملے جس کے تصور سے ہی اسے کوفت ہو رہی تھی۔

پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے اس نے خاصی حد تک اپنا ذہن بٹا لیا تھا۔ آج کمپنی برانچز کے مینیجرز کی میٹنگ تھی۔ عیشا علی، احمر کے مقابلے میں پچھلی میٹنگ میں بہتر نکات کے ساتھ شریک ہوئی تھی۔ اس مرتبہ احمر کی پوری کوشش تھی کہ مینیجر احمر حیات سے بڑھ کر کسی کی بھی پرفارمنس سامنے نہ آئے۔ اس کے لیے اس نے بھرپور کوشش کی تھی۔ اسے امید تھی کہ اس کے حالیہ نتیجہ خیز اقدامات طرح دار سی مینیجر عیشا علی کی تمام محنت سے بڑھ کر ثابت ہونگے اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ احمر کے پیش کردہ نکات اور کمپنی کے لئے منافع بخش اقدامات اس کے لئے مضبوط دلائل بن گئے۔ عیشا علی کو احمر نے کچھ عرصے کے لئے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

''احمر آپ کی تجاویز بہت ہی عمدہ ہیں۔'' خوشدلی سے سراہتے ہوئے عیشا احمر کی جانب متوجہ ہوئی اور احمر نے اس کے تاثرات میں کچھ کھوجنا چاہا لیکن اس کی نگاہ اس کی کتنے خم کھاتی مانگ پر ٹک گئی جو عیشا علی کے خوبصورت سلکی بالوں کے بائیں جانب واضح تھی۔ جدید تراش کے لباس کے ساتھ خوبصورت سی عیشا بڑی لائق مینیجر تھی۔ اپنے کندھوں تک تراشے اخروٹی رنگ کے بالوں کو وہ کم ہی کھلا چھوڑتی تھی، اکثر بغیر مانگ کے بنے سمیٹے بالوں کے ساتھ وہ کام پر موجود ہوتی تھی۔ لیکن لگتا تھا اس میٹنگ کے لئے وہ بطور خاص اپنے اوپر توجہ دے کر آئی ہے۔ اس لیے احمر کی نگاہ بھی اس کے مختلف انداز پر ٹھہر گئی تھی۔

عیشا علی نے اسکی نگاہ کا ٹھٹکنا اپنے اوپر محسوس کیا اور مسکرادی۔ اسکی مسکراہٹ کو احمر نے دیکھا ہو یا نہیں لیکن کامیاب میٹنگ کے بعد ملنے والا اطمینان اب اضطراب میں ڈھل گیا تھا۔ ایک بار پھر سارا ذہن میں آ گئی تھی۔ اس کی نظریں پُر سوچ سی دیکھ کر عیشا علی کے اندر فرحت سی پھیلنے لگی۔ اسے احمر پسند تھا اور احمر کے سامنے اپنا آپ منوا کر وہ اس کو پانا چاہتی تھی، کوئی عامیانہ اور فضول حرکت اس چاہت کو پورا کرنے کے لیے کبھی اس نے نہ کی تھی۔ لیکن تین سال کی لگن نے بھی عیشا علی کو کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہونے دیا تھا۔ احمر کے کسی انداز، کسی فقرے یا کسی نگاہ نے عیشا علی کے دل میں کوئی خوش گمانیوں کی کونپل نہ پھوٹنے دی تھی۔ مگر آج اس نے احمر کی نگاہ میں توجہ محسوس کی تھی۔ وہ آج معمول سے زیادہ ہنس رہی تھی۔ احمر کی نگاہ بھی گاہے بہ گاہے اس پر رکتی جسے وہ جان چکی تھی۔ خوشی عیشا علی کے روم روم سے پھوٹ رہی تھی۔

''یہ اتنی ٹیڑھی میڑھی مانگ کے ساتھ بال کیوں بناتی ہے؟ مانگ تو بس ایسی اچھی ہوتی ہے جیسی......'' احمر نے ایک بار پھر لنچ کے وقفہ میں کافی کا سپ لیتے ہوئے عیشا علی پر نظر ڈالی اور بے ساختہ سارا کو ایک بار پھر یاد کیا۔ اسکی یاد کے ساتھ خود بہ خود اس کی آنکھوں میں جو رنگ ٹھہرے وہی عیشا علی کو غلط فہمی میں مبتلا کر گئے۔ جسے وہ اپنے لیے چاہت کی پھوار کا پہلا قطرہ سمجھ رہی تھی وہ تو احمر حیات کی آنکھوں میں کسی اور کی عنایت تھی...... جو خود اس کے لئے ایک حد تک اجنبی تھی مگر پھر بھی دل میں جگہ بنا چکی تھی۔ چاہے زبردستی سہی۔

آج احمر کی سالگرہ تھی، گاہے بہ گاہے آفس کولیگز کی

جانب سے ٹریٹ کا تقاضا ہو رہا تھا۔سیل فون نے بھی ایسی فضولیات کے لئے بڑی آسانی کر دی ہے۔ ریمائنڈر لگا دو اور پورا سال آرام سے یہ مشین آپ کو بتاتی رہے گی کہ کونسا لمحہ آپ نے کس کے نام کیا تھا۔

شام ڈھلے دوستوں کو پزا ٹریٹ دے کر گھر لوٹتے ہوئے احمر کے ذہن میں اپنا خواب پھر تازہ ہوگیا۔''سارا اور اس کی آنکھیں۔'' گاڑی کا رخ خود بہ خود اسٹور کی جانب ہوگیا تھا۔ گاڑی پارک کرتے ہوئے اسکی نگاہ اس بچی پر پڑی جو پھول بیچ رہی تھی۔ یہ وہی تھی جو کل بے سدھ بینچ پر تھی، جس کی وجہ سے احمر نے پہلی بار کسی میلی کچیلی چیز کو چھوا تھا۔اس کے تن کے کپڑے بھی میلے تھے اور اسکی صورت میں بھی کوئی اجلا پن نہیں تھا۔عجیب سے نشانات اس معصوم چہرے پر تھے۔ احمر قدم بڑھاتے ہوئے اسٹور کے خودکار دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ چند لمحوں بعد وہ اس فلور پر موجود تھا جہاں سارا ہوتی تھی۔ کاؤنٹر پر اس کے سامنے کھڑا شخص اس سے انگریزی میں بات کرتا ہوا برہم لگ رہا تھا۔ سارا کا چہرہ بھی شرمندگی سے رنگ بدل چکا تھا۔ اردگرد کھڑے لوگ بھی ٹھٹک کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ چند سیکنڈ میں ہی سارا کی آنکھیں بھر آئیں تو احمر کے ذہن میں اپنا خواب ابھر آیا۔ حیران سا یہ واقعہ دیکھتا ہوا اب وہ مضطرب ہوگیا تھا۔ یکدم سارا تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی فلور کراس کرتی سیڑھیاں اتر گئی۔ یہ سب احمر نے محض دو منٹ ہی دیکھا، مگر اتنی دیر میں کسی نے بھی ان دونوں کے درمیان مداخلت کی کوشش نہ کی تھی۔ سارا کو جاتا دیکھ کر وہ شخص پلٹا تو احمر جیسے گنگ رہ گیا۔

''براؤن!!'' اس کی سرگوشی سی ابھری۔''یہ اور سارا ......نہیں ایسا کیسے ہوسکتا ہے سارا اس کی کوئی ہو۔'' دل میں آنے والے خیالات کے ریلے میں اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ کب تقریباً بھاگتا ہوا سیڑھیاں پھلانگ کر اتر گیا تھا۔ لاشعوری طور پر وہ سارا کو تلاش کر رہا تھا۔ سپر مارکیٹ سے باہر قدم رکھتے ہی اسے بہت فاصلے پر جاتی کسی لڑکی پر سارا کا شبہ ہوا تو اس نے گاڑی کا رخ ادھر کر دیا۔

اسٹور کے لیے مخصوص یونیفارم پہنے وہ ناہموار چال کے ساتھ کسی سمت چلی جا رہی تھی۔ احمر عجیب شش و پنج میں تھا، کیسے اس کو متوجہ کرے، گاڑی اس کے قریب روکتے ہوئے اس نے اس کا نام پکارا مگر وہ بنا رکے چلتی ہی رہی ایسے جیسے اسکی سماعتوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

اردگرد گزرتی گاڑیاں اورانسان احمر کی پیشانی عرق آلود کرنے کے لئے کافی تھے۔

ایسی کسی فضول حرکت کا اس نے بطور تھرل بھی نہ سوچا تھا جہاں وہ مصروف سڑک پر بے نیازی سے چلتی لڑکی کا پیچھا کرتے ہوئے احمق لگ رہا ہو۔گاڑی سے اتر کر اس نے چند قدم سارا کے پیچھے بڑھائے اور پھر راہ چلتے کسے گئے فقرے نے اس کا رواں رواں غصہ میں بھر دیا۔اس کے حواس گویا مختل ہو گئے تھے۔تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے سارا کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹ لیا اور کھینچتا ہوا گاڑی تک لے گیا۔سارا کا چہرہ خوف سے سفید سا پڑنے لگا تھا۔وہ بنا آواز نکالے بے جان نظروں سے اسکو دیکھتی رہی۔گاڑی کا دروازہ کھول کر اس میں دھکیلتے ہوئے احمر کو لگا پشت پر کتنی ہی نظریں اس کی حرکت کو دیکھ رہی ہیں۔شعلہ بار نظروں سے اسے سارا کو دیکھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔جیب میں پڑا سیل بھی پچھلے کئی منٹ سے شور مچا رہا تھا، جسے سننے کا موقع بھی اسے نہ ملا تھا۔ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر جماتے ہوئے اس نے کال ریسیو کی۔حسب توقع گھر سے فون تھا۔ساری مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں سوائے ان کے جن کے فطری تقاضے دنیا کے غیر فطری جھمیلوں نے ختم کر دیئے ہوں، بچوں کی سانسوں میں اپنا سانس تلاش کرتی......ان کی سلامتی پر جان دیتی......

''کہاں ہو احمر، اگر کہیں جانا تھا تو بتا دیا ہوتا، کچھ تو اپنا بے فکرا پن اب ختم کر دو......'' ماں کا محبت بھرا غصہ سن کر وہ کچھ بول ہی نہ سکتا تھا۔

''دوست کے ساتھ ہوں کچھ دیر میں گھر پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے نرمی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

فون پر بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں اتنی شائستگی تھی کہ ساکت سی بیٹھی سارا نے اپنی خوف سے گنگ ہوتی زبان میں کچھ جان پڑتی محسوس کی، اعصاب نے بھی جیسے انگڑائی لی اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئی، گاڑی نہ جانے کہاں جا رہی تھی۔ یہ سوچ اس کو پھر خوفزدہ کر گئی اس نے دروازے کی طرف کھسکتے ہوئے سہمی سی نظر اپنے برابر بیٹھے ''غنڈے'' پر ڈالی جس سے وہ محض ایک دن پہلے بنا کسی خوف اور کھٹکے کے مدد لے چکی تھی، اور آج وہ زبردستی اس کو اپنی گاڑی میں بٹھا چکا تھا۔دروازہ کھول کر چلتی گاڑی سے اترنے کا نتیجہ کیا ہو سکتا تھا، اس سے بے پروا وہ کودنے کے لیے تیار تھی پہلو میں ہینڈل ٹٹولتے ہوئے اس نے اپنے اندازے سے اس کو حرکت دیتے ہوئے دروازے کو دھکا دینا

چاہامگر اس میں جنبش بھی نہ ہوئی۔ اسی لمحہ گاڑی کے پہیوں کی چر چراہٹ ابھری اور وہ رک گئی۔ سارا کے سارے مربوط ہوتے خیالات بھک سے اُڑ گئے۔

''اگر مرنا ہی ہے تو میرے گلے پڑ کر کیوں مر رہی ہو اور دس ہزار طریقے ہیں کوئی بھی استعمال کر سکتی ہو۔''

احمر کی آواز کی سختی نے اسکو پھر خوفزدہ کر دیا مگر وہ فوراً ہی کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اتر گئی۔ یہ علاقہ کونسا تھا، کیسا تھا، وہ نہ جانتی تھی۔لیکن اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی خواہش اس کو اس گاڑی سے دور ہونے پر اکسا رہی تھی۔ وہ اسٹور سے نکل کر کہاں پھنس چکی ہے شاید کسی کو بھی اسکی فکر نہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کسی کا دل بھی سارا کی حفاظت کے لئے نہ لرز رہا ہوگا۔ خیالات ابھرے تو اس کی آنکھوں سے آنسو پھر بہنے لگے۔ اس کے تیز تیز قدم اور گرتے ہوئے آنسو اسے ایک بار پھر لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنا چکے تھے۔ سہمے ہوئے اس نے پلٹ کر نگاہ ڈالی کہ وہ گاڑی والا چلا گیا یا وہیں کھڑا ہے۔ مگر وہ وہیں دور کھڑا اس کو دیکھ رہا تھا۔

''ارے چندا! روتی کیوں ہو، ہم ہیں نا، آؤ ہمارے ساتھ۔'' دلار سے بولتے ہوئے اس نوجوان نے سارا کو چھوا تو وہ بدک کر پیچھے ہوگئی۔ یہ کونسا علاقہ ہے۔ میں کہاں جاؤں...... وہ بری طرح سہم گئی تھی۔ سورج کی روشنی ختم ہوئے گھنٹہ بھر ہو چکا تھا۔ رات پوری طرح پھیل چکی تھی اور اس کوئی والی وارث بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ یکدم پلٹ کر بھاگتی ہوئی احمر کی طرف بڑھ گئی جو بدستور اسی جگہ کھڑا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے وہ بے آواز آنسوؤں کے ساتھ روئے جا رہی تھی۔

احمر نے اس کے بیٹھتے ہی اپنی نشست ایسے سنبھال لی جیسے یہ سب کچھ ترتیب دیئے پروگرام کے مطابق ہوا ہو۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی ڈیش بورڈ پر رکھے ٹشو بکس سے ڈھیر ٹشو کھینچتے ہوئے اس نے سارا کی جانب بڑھا دیئے جسے تھامنے کے بجائے وہ احمر کا چہرہ ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔

''تم آخر میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو، اور کہاں لے جا رہے ہو؟'' گاڑی ڈرائیو کرتے احمر نے سامنے سڑک پر سے نگاہ ہٹا کر اس کی آنسو بھری آواز سن کر اس کی طرف رخ کیا، چہرے پر بالوں کی لٹیں بکھری تھیں، خاصی سہمی ہوئی شکل اور اس کے سوال دو مختلف کیفیات لگ رہی تھیں، سوال میں وہ سہم نہیں تھا جو اس کی شکل سے ہویدا تھا۔ بات اور موقع قطعاً دلچسپ نہ تھا لیکن

احمر کواس کی صورت دیکھ کر نہ جانے کیوں ہنسی آ گئی۔ بہ مشکل سیریس ہوتے ہوئے اس نے اس کے دھیرے دھیرے کپکپاتے وجود پر نظر ڈالی۔

''غور سے دیکھو میں تمہیں غنڈہ لگتا ہوں جو راہ چلتی لڑکیوں کو زبردستی اپنی گاڑی میں بٹھا لیتا ہو......میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے میری شخصیت ہیرو کی طرح ہے نا کہ ولن کی طرح۔'' فخریہ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے گاڑی روک دی جھکے ہوئے سر کے ساتھ بیٹھی سارا نے یکدم سر اٹھایا تو وہی اسٹور سامنے تھا جہاں سے اس سارے واقعہ کا آغاز ہوا تھا۔

''یہاں تم اب شاید ہی دوبارہ کام کرسکو۔ لیکن بہرحال یہاں اتر کر جہاں جانا چاہو چلی جاؤ۔'' احمر نے گردن کے اشارے سے اسٹور کی جانب اشارہ کیا تو وہ ساکت پتلیوں کے ساتھ سامنے دیکھنے گئی۔ ''کدھر جاؤں میں؟'' اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ احمر بہ مشکل ہی سن سکا۔

''اپنے گھر اور کہاں۔''

''مجھے اپنے گھر کا پتہ نہیں معلوم۔''

اسکے سیاہ بالوں کے درمیان مانگ اس وقت واضح نہ تھی، بے اختیار احمر کا دل چاہا کہ وہ اس کو اسی طرح شفاف دیکھے جیسا وہ ہمیشہ دیکھتا آیا ہے۔ لیکن اسکے جواب نے اس کو الجھن میں ڈال دیا۔ ''کیا مطلب تمہیں اپنے گھر کا پتہ نہیں معلوم؟ کیا براؤن کے ساتھ جھگڑے نے تمہاری یاداشت ختم کردی ہے؟''

احمر نے پہلے حیرت اور پھر مزاحیہ انداز میں اس سے سوالات کیے تو وہ جیسے ششدر سی رہ گئی۔ ''آپ......تم براؤن کو جانتے ہو، کیسے؟'' آپ سے تم پر آتے ہوئے وہ ٹھٹکی لیکن اس کے لہجے میں حیرانی ہی حیرانی تھی۔ احمر نے اسکو جواب دینے کے بجائے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کردی۔ گاڑی کے حرکت میں آتے ہی وہ پھر ہراساں سی نظر آنے لگی۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''اپنے گھر۔''

احمر نے بظاہر جتنے اطمینان سے جواب دیا تھا وہ اندر سے اتنا ہی بے اطمینان تھا۔ ''چار دن کیا اس سے میری آشنائی حقیقتاً چار گھنٹوں کی بھی نہیں۔ کیا کہہ کر تعارف کراؤں گا گھر میں، اور کتنی دیر اسکو گھر میں رکھ سکتا ہوں میں؟'' بجلی کی تیزی سے ابھرتے ہوئے خیالات کو جھٹکا لگا کہ سارا کی سسکیاں ابھر گئی تھیں۔

''مسئلہ کیا ہے تمہارا؟ گھر تم جانا نہیں چاہ رہیں۔

میری گاڑی سے اترنا بھی نہیں چاہ رہیں۔ مجھ سے خوفزدہ بھی ہو۔اور تمہیں میں مزید اپنے گلے نہیں لٹکا سکتا۔ جاؤاتر جاؤابھی اسی وقت۔''

اس نے اپنے گھر کے آگے گاڑی روکتے ہوئے اس سے سرد لہجے میں کہااور خود گاڑی سے باہر کھڑا ہوگیا۔ یہ خوشحال لوگوں کا علاقہ تھا۔گلی میں دور دور تک کوئی انسانی وجوداس وقت موجود نہ تھا۔گھروں کے چوکیداروں کی صورت بھی گیٹ کے ساتھ جڑی گھنٹی بجانے کی صورت میں نظر آتی تھی۔تب بھی یا تو وہ گیٹ سے ہی ملحق اپنی کوٹھری کی کھڑکی واکرتے اور آنے والے کی اوقات دیکھ کر باہر آتے یا نہیں آتے یہ ان پر منحصر تھا۔گلی کی پوری لمبائی میں ایک جانب ٹاؤن ہاؤس اور دوسری جانب پہاڑی سلسلہ تھا جو اندھیرے میں سرکاری بلبوں کی روشنی کے باوجود گلی کو پراسرار سا تاثر دیتا تھا۔ پرسکون اور خاموش ترین رات مغرب ہوتے ہی اس علاقے میں اتر آتی تھی۔گلی کے آغاز میں لگے بیریر پر دائیں بائیں بیٹھے گارڈ بھی اپنی چوکیوں میں تھے۔سارا نے لرزتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔احمر گاڑی کا ہارن وقفے وقفے سے بجا رہا تھا مگر گیٹ کھلنے کے آثار نہ ابھرے تھے۔جھنجھلا کر اس نے سیل پر کچھ نمبر دبا کر کال ملائی۔

''امی گیٹ کیوں نہیں کھل رہا، سردار کہاں مرا پڑا ہے؟''

چند ہی سیکنڈ بعد کلچ کی آواز کے ساتھ گیٹ کھل گیا، احمر نے گاڑی سے اتر کر گاڑی اندر کرنے کے لئے اسکو پوری چوڑائی کے ساتھ کھولا اور پھر بھاگ کر آتے ہوئے سردار خان پر قہر آلود نگاہ ڈالتے ہوئے گاڑی کی چابی اسکی طرف اچھال دی۔''نمازیں ذرا کم پڑھا کرو۔گاڑی اندر کرو۔''احکامات دیتا ہوا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر جانے لگا۔

''میں کہاں جاؤں؟''سارا اتنی بے نیازی سے اسے جاتا دیکھ کر متوحش ہوگئی، سردار خان نے اچھنبے سے احمر اوراس اجنبی لڑکی کو دیکھا۔ وہ دونوں کے درمیان کسی بھی قسم کے تعلق کو جان نہ پا رہا تھا۔لڑکی احمر کے ساتھ ایک آدھ مرتبہ آنے والی لڑکیوں کی سی نہ تھی، وہ تو میم صاحبہ لگتی تھیں۔اور یہ...... یہ تو بہت ہی بے چاری سی لگ رہی تھی ان کے آگے۔وہ عجیب شش و پنج میں تھا، کھٹ سے گاڑی گیٹ سے اندر پورچ میں کھڑی کرتے ہوئے گیٹ اس لڑکی کے منہ پر بند کردے یا پھر احمر کے جواب کا انتظار کرے۔دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے احمر نے گردن ترچھی کرکے

پورچ کے اس پار نظر آتی اس لڑکی کو دیکھا جو پچھلے تین گھنٹوں سے اسکو خوار کر رہی تھی۔ حالانکہ یہ خواری خود احمر نے اٹھانی پسند کی تھی۔ رات دیکھا گیا خواب پھر آنکھوں میں زندہ ہوگیا تھا۔ سارا اوراس کی گیلی آنکھیں......''کیا بکواس ہے یہ!!'' دھیرے سے بڑبڑاتے ہوئے وہ واپس پلٹا تو سردار خان گیٹ سے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔

''تمہارا کوئی والی وارث نہیں ہے؟ کیوں تم اپنے گھر نہیں جانا چاہتیں، براؤن کون ہے تمہارا؟ کیوں وہ تمہیں گھر آنے کو کہہ رہا تھا؟''

دبی زبان سے پوچھتے ہوئے اس نے انگلی کے اشارے سے سردار خان کو وہاں سے جانے کا اشارہ کردیا۔ لڑکی پر گہری نگاہ ڈالتے ہوئے وہ چوکیدار دائیں جانب راہداری سے اندر کہیں غائب ہوگیا۔ احمر نے اس کے جاتے ہی سارا کو بازو سے پکڑ کر گیٹ سے اندر کھینچ لیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ خاصی بلند تھی اگر احمر کس کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ نہ رکھ دیتا۔ گھٹی گھٹی سی آواز پھر بھی نکلی اور احمر کو اپنے پیچھے کھٹکا محسوس ہوا۔

''کون ہے یہ؟ سردار کہاں ہے؟ سب خیریت تو ہے احمر؟'' ماں کے گھبرائے لہجے میں سوالات نے احمر کو بھی بوکھلا دیا، وہ بدستور سارا کے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔

''آپ اندر چلیے امی میں آتا ہوں۔'' اس نے سنبھلتے ہوئے ماں کو جواب دیا تو بھی وہ وہیں کھڑی رہیں لیکن ان کو دیکھ کر سارا جیسے پرسکون سی محسوس ہونے لگی۔ احمر نے ہاتھ ہٹاتے ہوئے اس کو سلگتی نظر سے دیکھا۔''کون ہے یہ اور کیا معاملہ ہے یہ سب؟''احمر کی ماں سنبل حیات ایسے حالات میں محض احمر کے کہنے سے اندر کیسے چلی جاتیں۔ سارا لپک کر ان کے ساتھ جڑ کر کھڑی ہوگئی۔

انہوں نے مشتبہ نظروں سے لڑکی کو دیکھا جو کسی قسم کے یونیفارم میں محسوس ہورہی تھی۔ بظاہر جو کچھ نظر آرہی تھی اس میں وہ چوراچکی بھی نہیں لگ رہی تھی۔ لیکن ایسی کوئی معزز بھی نہیں لگ رہی تھی کہ ان کے لائق فائق بیٹے کے حلقہ یاراں میں شامل ہوتی۔ پھر کچھ لمحوں قبل دیکھا گیا منظر بھی عجیب ہی تھا۔

''امی اس کو لے کر اندر آجایئے۔''احمر نے شرمندہ سی آواز میں کہتے ہوئے قدم اندر گھر کی جانب بڑھا دیئے۔

ماں نے جاتے ہوئے بیٹے کی پشت پر دیکھا

اور تذبذب کے عالم میں سارا کو ہاتھ سے آگے چلنے کا اشارہ کر دیا۔لڑکی کے بے انتہا دبلے پتلے وجود پر لمبی سی لہراتی ہوئی چوٹی میں سیاہ رنگ کا بینڈ لگا تھا سفید نگ جس میں جابجا جڑے بڑے خوشنما لگ رہے تھے۔سنبل حیات کی نظر میں لمحے بھر کو اس کے بالوں پر ٹکی مگر جلد ہی ان کا ذہن اس کے اور اپنے بیٹے کے درمیان تعلق پر الجھ گیا۔

''بیٹھو!'' لاؤنج میں رکھے کین صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے اس کو بیٹھنے کو کہا تو وہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی ٹک گئی۔

احمر کی موجودگی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید اپنے کمرے میں تھا۔لمحوں کی خاموشی کے بعد سنبل حیات خادمہ کو آواز دے کر پانی لانے کو کہا۔ جلد ہی ہری کانچ کی سی آنکھوں والی لڑکی ٹرے اٹھا لائی جس میں جگ اور گلاس تھے۔جدید وضع کے لباس میں سارا کو وہ لڑکی خادمہ کے بجائے گھر کے افراد میں سے لگی۔وہ پلٹنے لگی تو سنبل حیات نے اس کو پھر پکارا۔

''امیری!'' سارا نے چونک کر دیکھا۔''احمر صاحب سے کہو لاؤنج میں آ جائیں۔'' نپا تلا جملہ بول کر انہوں نے پانی کا گلاس سارا کی جانب بڑھا دیا۔

اپنے سوکھے حلق کو اس نے دو چار گھونٹوں سے تر کیا اور گلاس واپس ٹرے میں رکھ دیا۔گھر میں اتنی خاموشی تھی جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔وہ دلربا سی خادمہ بھی سبک خرام جھونکے کی طرح تھی اور پھر کہیں غائب ہو چکی تھی۔''وہ آخر یہاں بیٹھی ہے، کون ہے وہ، کس طبقے سے اس کا خمیر اٹھا ہے۔'' سنبل حیات کی گاہے بہ گاہے اٹھنے والی نگاہوں میں ابھرتے سوالات بڑے ہی واضح تھے۔خود سارا کی سمجھ نہ آ رہا تھا کہ اس گھر کی چار دیواری سے نکل کر وہ کہاں جا سکتی ہے۔اس کا سر جھکا ہوا تھا۔سامنے دیوار کی لمبائی پر بنی خوب چوڑی اور لمبی کھڑکیوں سے آتی خوشگوار ہوا کے جھونکے پہاڑوں پر اُگی ہریالی کی باس بھی اپنے ساتھ لا رہے تھے۔ایک لطیف سی مہک پر اس نے سر اٹھا کر اپنے اندر تازہ لہر دوڑتی محسوس کی۔نگاہ اوپر کی تو سامنے ہی وہ کھڑا تھا جس نے اب تک بظاہر اس کی مدد ہی کی تھی۔ کھڑکی کے سلائڈنگ ڈور کو کھسکاتے ہوئے احمر نے ماں کے قریب جگہ بناتے ہوئے سارا کو دیکھا جو اس پر ایک نگاہ ڈال کر گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھے جا رہی تھی۔

''براؤن کون ہے تمہارا؟'' اتنی خاموشی کے بعد جو

پہلا جملہ اس نے سنا تو وہ ایک ٹک اسے اور پھر سنبل حیات کو دیکھنے لگی۔

''میں سارا براؤن ہوں۔'' کمزور سی آواز میں دیئے گئے جواب نے احمر کو بے اختیار نشست سے کھڑا کر دیا۔

''تم......تم براؤن کی بیٹی ہو......سارا براؤن!!'' حیرت احمر کے لہجے میں سمٹ گئی تھی۔

سنبل حیات کے لیے پورا معاملہ ہی پہیلی تھا۔ وہ خاموش بیٹھی یہ مکالمے سن رہی تھی۔ انہیں اپنی اور حیات کی اولاد سے کسی بھی قسم کی گراوٹ کی کبھی بھی امید نہ تھی۔ نہ وہ جلد بازی سے معاملہ خراب کرتی تھیں۔ حیات صاحب آج کل اپنے آفس کی طرف سے ملک سے باہر تھے۔ وہ بھی اگر ہوتے تو اس سارے منظر کے بعد بھی احمر کے معاملہ سمیٹنے کا انتظار کرتے۔ وہ ان دونوں کے درمیان محض اس لیے موجود تھیں کہ یہ لڑکی اس سے پہلے احمر کے ساتھ آنے والی آفس کولیگز میں سے کوئی نہ لگ رہی تھی جو کچھ دیر کے لئے لاؤنج میں بیٹھ کر احمر کے ساتھ کسی معاملہ کو ڈسکس کر کے واپس ہو لیتی تھیں۔ یہ معاملہ کچھ اور ہی لگ رہا تھا، لیکن وہ منتظر تھیں کہ احمر فارغ ہو کر خود بتائے۔ سارا براؤن کے نام پر احمر کو اس قدر حیرت زدہ دیکھ کر وہ اور متجسس ہو گئیں کہ یہ تمام کتھا ہے کیا۔ ''تمہارا مطلب ہے تم براؤن کی بیٹی ہو۔'' براؤن اور اس کی باتیں جو اس نے اسٹور میں سنی تھیں وہ انگریزی کے اتنے مختلف لہجے میں تھیں کہ شاید ہی کوئی ان دونوں کی بات پوری طرح سمجھ پایا ہو۔ سارا نے ایک آدھ ہی فقرہ بہ مشکل بولا تھا۔ محض براؤن کی ناراضگی بھری آواز ہی خوب نمایاں تھی۔ احمر کے واضح سوال پر اس نے جواب دینے کے بجائے اپنی ہتھیلی کھول لی۔

''تم جواب دو گی ہاتھ کی یہ لکیریں نہیں۔'' احمر نے جھنجھلائے لہجے میں اس کی حرکت دیکھتے ہوئے اس کو ٹوکا۔ یہ تو سب اس خواب کا قصہ تھا جو وہ اتنا کھڑاگ پھیلا بیٹھا تھا ورنہ اسٹور والے واقعے کی طرح زندگی میں عمومی سطح سے ہٹ کر نظر آنے والے اس نوعیت کے مناظر دیکھ لینے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ احمر ان کے لیے اپنی قوت اور وقت صرف کر دیتا، لیکن اس معاملے کی پوری تصویر سامنے نہ ہونے کے باوجود نہ تو وہ اس سے بے نیاز ہو سکتا تھا اور نہ دست بردار۔

''اگر تم براؤن کی بیٹی ہو تو اپنے گھر جاؤ۔ باپ سے ناراضگی کا مطلب یہ نہیں کہ جوان بیٹیاں گھر چھوڑ

دیں۔'' بے انتہا کڑوے لہجے میں بات کرتے ہوئے وہ اس کے قریب آن کھڑا ہوا۔ تو اس نے سر اٹھا کر اس شخص کو دیکھا جو خواہ مخواہ اسکے معاملہ میں گھسا جا رہا تھا۔

''فضول کے تبصرے کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں۔''

غیر متوقع طور پر اس کی زبان سے یہ جملہ نکلا تو سنبل حیات کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

''تو بیٹا تم خود بتا دو نا تاکہ دوسرے تم پر فقرے نہ اچھال سکیں۔'' تیکھے لہجے میں کہتی ہوئی ماں نے احمر کو ملامتی نظروں سے دیکھا تو وہ نظریں چرا گیا۔'' کیا قصہ ہے یہ، ختم کرو یہ سب اس لڑکی کو گھر سے روانہ کرو اور پھر مجھے بتاؤ سارا معاملہ۔'' ان کی نظریں وہ بہ خوبی پڑھ چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ماں سے کیسے کہے اور کیا بتائے۔ اپنے اور سارا کے درمیانی رابطہ کو کیا عنوان دے۔ خواب کی تعبیر، دل لگی، تجسس یا پھر کوئی اور پہچان، اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے دل میں سارا کے لئے اس خواب کے ذریعے اُنس انجیکٹ کر دیا گیا ہے جو اس کی رگوں میں دوڑتے لہو کے ساتھ شامل ہو چکا ہے۔

اچانک اسکو میٹنگ میں عیشا کا نکھرا نکھرا سراپا اور اس کی زگ زیگ مانگ یاد آ گئی۔ شاید سارا کے بے ترتیب ہوتے بال اس یاد کا سبب بنے تھے ورنہ عیشا علی کے جذبے بہر حال اتنے طاقتور ضرور تھے کہ احمران کو سال بھر پہلے جان چکا تھا۔ لیکن اس کے اپنے دل میں اس کے لیے کبھی کوئی خاص احساس نہ ابھرا تھا، کوئی خوشنما احساس، کوئی جگنو سا خیال لمحے بھر کے لئے بھی احمر کے دل میں عیشا کے لئے نہ ابھرا۔ وہ اس کے لیے اتنا ہی عمومی رویہ رکھتا تھا جیسا کسی اور کولیگ کے ساتھ، بس اتنی ہی دلکش مسکراہٹ جس سے تعلقات نبھائے جاتے ہیں، لطیف جذبات نہیں۔

یہ سب رنگ، خوشبو، جگنو، احساسات اور محسوسات پنپنے شروع بھی ہوئے تو کس کے لئے! وہ واقعی اپنی کیفیت پر خود حیران تھا۔ اس میں ایسا ہے کیا جو اسکی اتنی فکر پالی جائے۔ اس نے اپنے بالکل سامنے بیٹھی ستے چہرے کے ساتھ لیونارڈو کی مونالیزا جیسی لڑکی کو دیکھا۔ کوئی اور روئے زمین پر احمر کے دیئے اس لقب سے کتنا ہی اختلاف رکھتا لیکن بہر حال اس کو ایسا ہی لگتا تھا اور جو انسان کو لگتا ہے وہ اس کا یقین ہوتا ہے اور احمر کے خیال میں مونالیزا قطعاً کوئی حسین تصویر نہ تھی۔ اگر آرٹ کے جوہریوں کے لئے وہ شہکار تھی بھی تو عام نگاہ

کے لئے اس میں حسن کا کوئی عنصر موجود نہ تھا۔ آرٹ اور ریاضی کے عمدہ ترین کلیے اس کو عجوبہ ظاہر کرتے تھے، حسن بس وہی لوگ اس میں جانتے ہیں جو ان کلیوں سے واقف ہوں کہ کیسے لیونارڈو نے ریاضی کے پیچیدہ ترین کلیوں کا مہارت سے استعمال کرتے ہوئے مونا لیزا تخلیق کی تھی۔ بظاہر نہ اس تصویر میں جلوے کے شرارے تھے اور نہ دلکشی کے دھارے۔ سارا میں بھی احمر کو غالبًا ایسے ہی منفرد سے پہلو متوجہ کرتے تھے۔ اس حساب سے وہ بھی جوہری تھا۔ مگر ایسا جو اس کو تاج میں سجانے سے گریزاں تھا۔

☆☆☆

میری لائبریری سے

کتاب کا نام: محمدؐ پیغمبر اسلام

مصنف : کانسٹنٹ ورجل جورجیو

مترجم : میر مشتاق حسین

پبلشر: ادارہ ترقی فکر 315/C فیصل ٹاؤن لاہور

کالم سے پہلے کنور مہندر سنگھ بیدی کا شعر عرض ہے

؎ عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں

جی جناب السلام علیکم! موضوع گفتگو معلوم ہو گیا ہوگا جس کی تمہید اتنی طویل ہے کہ کتاب پر تبصرہ کے لئے اللہ جانے کتنے کالم درکار ہوں گے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی (جنہیں ایک لاکھ احادیث بمع اسناد زبانی یاد تھیں) کہتے ہیں عرب کے ایک شاعر نے نبی کریمؐ کی شان میں نعتیہ اشعار کہنا شروع کیے۔ جب گننے بیٹھا تو اشعار کی تعداد چالیس ہزار تھی۔ دنیا کی کسی بھی زبان میں کسی کی تعریف پر کہی گئی نظم کے اتنے اشعار ایک ریکارڈ ہے۔ علامہ عسقلانی نے اسے معجزہ قرار دیا ہے۔ ان نعتیہ اشعار کا ترجمہ اردو میں حفیظ تائب نے کیا ہے جن کا اختتام ان دو اشعار پر ہوتا ہے۔

تھکی ہے فکر رسا اور مدح باقی ہے
قلم ہے آبلہ پا اور مدح باقی ہے
تمام عمر لکھا اور مدح باقی ہے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

اللہ اکبر! چالیس ہزار اشعار میں آپؐ کی تعریف بیان کر کے شاعر بے بس ہے اور "مدح باقی ہے" کہہ کر اس بے بسی کا اظہار کرتا ہے تو یہ کم مایہ، ناقص العقل ان کی تعریف میں کیا کہے؟؟ بس ورفعنا لک ذکرک، کہہ کر ثناء خوان مصطفیؐ میں شامل ہو جاتے ہیں۔

قارئین کرام! معجزہ یہی نہیں کہ چالیس ہزار اشعار ایک ہی ہستی کی تعریف میں۔ معجزہ یہ بھی ہے کہ دنیا بھر کے غیر مسلموں نے ہزار تعصب کے باوجود ان کی شان کے اعتراف میں جو کچھ کہا وہ بے مثال و بے نظیر ہے۔ ہندوؤں کا مہاتما گاندھی ہو یا سکھوں کا کنور مہندر سنگھ بیدی، سر ونسٹن چرچل ہو یا دی ہنڈرڈ والے مائیکل ایچ ہارٹ سب ان کی عظمتوں کا اعتراف و اقرار کرتے

ہیں۔

ربیع الاول کی مناسبت سے دلی خواہش تھی کہ اپنے پیارے قارئین کے لئے ایسی کتاب منتخب کی جائے جو سراہے جانے کے قابل ہو۔ اللہ بھلا کرے صائمہ کا اس سے پوچھا تو اس نے کتاب کا اور مصنف کا نام لکھ بھیجا۔ کئی دن تو مصنف کا نام یاد کرنے میں لگے۔ پھر اللہ بھلا کرے عروہ اور عمار کا جو کتابیں پیش کرنے میں ثواب کے حقدار ہیں ان سے کتاب منگوائی۔ کتاب کھولنے سے پہلے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ کتاب کھول کر زندگی میں پہلی دفعہ آپؐ کی سیرت کا مطالعہ کس زاویئے سے ہوگا۔ جب کتاب پڑھنا شروع کی تو بار بار حیرت ہوتی ہے کہ اللہ! ایک غیر مسلم اور اتنی عمدہ کتاب؟؟ کتاب ختم ہونے تک کئی دفعہ آپؐ کی محبت میں ایسا اضافہ محسوس ہوا کہ ساری زندگی اس سے محروم ہی رہی تھی۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی آسان اور سلیس زبان میں ایک **بَشَراً رَّسُولا** کی زندگی کا احوال ہے۔ اور اس کے پس منظر میں عرب ماحول اس قدر عمدگی، دلچسپی سے پیش کیا گیا ہے کہ ایک لمحہ کے لئے مجھے توجہ ادھر ادھر کرنا پڑتی تھی تو دل کتاب میں ہی اٹکا رہتا تھا۔

کتاب میں ہر چیز کی جزئیات اور پس منظر موجود ہے۔ بلاشبہ یہ ایک خداداد مہارت ہے کہ پڑھنے والے کا دل اپنی تحریر کے زیر اثر مٹھی میں لیے رکھنا۔

کتاب میں واقعاتی انداز ہے اور بھرپور تاثر کے ساتھ۔ میری عادت ہے کہ کتاب پر تبصرہ کرنا مقصود ہو تو اہم نکات والے صفحات کو فولڈ کرتی رہتی ہوں۔ کتاب کے اڑتالیس صفحات تک کم از کم پچیس صفحات فولڈ ہو چکے تھے اس سے زیادہ اس کتاب کی اہمیت مجھ سے کیا بیان ہوگی۔

کتاب کا آغاز ''عبداللہ کے بیٹے محمدؐ نے بچپن میں بہت دکھ اٹھائے۔'' سے ہوتا ہے۔ ''جب محمدؐ اپنی والدہ کے ساتھ پہلی بار مدینہ آئے تو پہلی بار انہوں نے وہاں کا حوض دیکھا جس میں انہیں اپنے بدن کا عکس دکھائی دیا۔ یہ واقعہ ہمیشہ ان کے ذہن میں تازہ رہا۔ مکہ میں پانی کم تھا وہاں اسے اس طرح ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ گرمیوں میں بچے اس میں نہا سکیں مگر مدینہ میں پانی کے تالاب تھے بچے ان میں نہایا کرتے تھے اور احساس خنکی سے لطف اندوز ہوتے۔''

کتاب کی بہت بڑی خوبی ہر بات کا پس منظر بیان کرنا ہے۔ یہ پس منظر قاری کو یوں مسحور کرتا ہے کہ میں نے آج تک سیرت کی جتنی کتب کا مطالعہ کیا ہے

وہاں پر دہرائے ہوئے واقعات پڑھے۔ مثال کے طور پر حضرت آمنہ کی وفات کا تذکرہ ہے لیکن ان لوگوں میں کسی کے حالت نزع میں کیا رسم ورواج تھے وہ اس کتاب میں تحریر ہے۔یوں ایک منظر نگاری (Visual) کی سی صورتحال بن جاتی ہے اور پڑھنے والا بچشم خود دیکھتا اور محسوس کرتا ہے (میرے ساتھ تو ایسے ہی ہوا ہے)

ایک اور مثال اگلے صفحہ پر ہی سامنے آ گئی ہم عرب کے صحرا کا تذکرہ پڑھتے ہیں لیکن جارجیو کے نزدیک ''عرب کا صحرا'' کہہ کر گزرنا آسان نہیں وہ اس کی وضاحت یوں کرتا ہے۔

''جب تک انسان عرب کے وسیع صحراؤں خاص کر مشرقی صحرا میں رہائش پذیر نہ ہو۔ وہ یہ نہیں جان سکتا کہ صحرا کی وسعت وسکوت، تفکر کی حس کو کس قدر تیز کرتا ہے اور انسانی سوچ کو کس قدر پختگی بخشتا ہے۔صحرا ئے عرب کے برگ وگیاہ یورپی ممالک کے نباتات سے بہت فرق رکھتے ہیں۔گرم صحراؤں میں کوئی درخت یا پودا زندہ نہیں رہ سکتا تاوقتیکہ اس میں نمی کی بجائے عطر نہ ہو حتیٰ کہ عربستان کے خار مغیلاں سے بھی بہترین عطر حاصل کیا جاسکتا ہے۔یورپ کے پھول جو خاصیت عطر سے عاری ہیں اگر عرب کے صحرا میں کاشت کردیئے جائیں تو دو یا تین نسلوں کے بعد ان میں خاصیت عطر پیدا ہوجائے گی اور یورپ کے یہ کوتاہ قد پودے صحرائے عرب میں کاشت کے بعد درخت کی طرح تناور ہو جائیں گے۔''

محترم قارئین! اب آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔اسی صفحہ پر چند سطور۔

''عرب کے گرم صحراؤں میں اگر ایک شخص ایک عقیدہ اپنا لیتا تھا تو اس پر عمل کرنا خود پر لازم کر لیتا تھا۔ انسانی طبیعت میں تضاد اور منافقت اس وقت شروع ہوئی جب بڑے بڑے مذاہب صحرا کی حدود سے نکل کر اردگرد کی مملکتوں میں جو ریگستانی نہیں تھیں پھیل گئے۔ اس وقت جن لوگوں نے صحرا کی وسعتوں میں اپنے جذبات کا ادراک کیا تھا انہوں نے سخت گیری کی اور کئی قسم کے فرقے وجود میں آئے۔۸ سال کی عمر میں پیغمبر اسلام مجبور ہوئے کہ صحرا میں گلہ بانی کریں۔وہ منہ اندھیرے شہر سے نکل جاتے اور شام تک صحرا میں ہی رہتے۔اپنی نگاہیں لامحدود آسمان کی پناہوں میں اور وسیع افق پر گاڑ دیتے اس سے پہلے کہ آفتاب غروب ہو گلہ آبادی میں لے آتے اور چچا ابوطالب کے گھر جا کر

سو رہتے۔''

پیارے قارئین! کتاب کے ہر صفحے پر جا بجا موتی بکھرے ہیں خواہ اصحاب فیل کا واقعہ ہو یا عبدالمطلب کی منت پوری کرنے کا انداز تحریر مدلل اور دلچسپ ہے۔

''یوحنا کی انجیل میں لکھا ہے خداوند تمہارے لیے میرے بعد پاراکلت بھیجے گا۔ لفظ پاراکلت یونانی لفظ ہے جس کا معنی ہے تسلی دینے والا، طاقت دینے والا، حمایت کرنے والا۔ یوحنا کے قول کے مطابق مسیحؑ نے پیش تر اس کے کہ جہاں سے تشریف لے جاتے اپنے پیروؤں سے کہا میرے بعد ایسا شخص آئے گا جو تمہارے لیے باعث تقویت اور حمایت ہوگا۔ عیسیٰؑ کا مقصود یہ تھا کہ یہ شخص ''پاراکلت'' عیسائیوں اور خداوند کے درمیان واسطے کا کام دے۔ تا کہ عیسائی تنہا نہ رہیں۔''

کتاب کے دوسرے باب میں فرانسیسی فلسفی ارنسٹ کہتا ہے ''دوسری قوموں کے علوم خصوصاً ایران کے علوم جو طلوع اسلام کے بعد عرب میں درآمد ہوئے عربوں سے واپس لے لیے جائیں تو باقی رہ جائے گا 'اونٹ' مگر میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ اس نے عمیق مطالعہ کے بغیر یہ بات کہہ دی ہے وگرنہ تمام علوم بالخصوص ایرانی علوم اگر عربوں سے واپس لے لیے جائیں تو تب بھی عربوں کے پاس قابل فخر صنف سخن باقی رہ جاتی ہے۔''

عربستان بڑی وسیع سرزمین ہے جس کا بیشتر حصہ ریت سے ڈھکا ہوا ہے ان ریگ زاروں میں جہاں گرم ریت کے جھکڑ چلتے ہیں عرب کا سرمایہ حیات تین چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے ایک خیمہ، جو آفتاب کی حرارت سے پناہ دیتا ہے، ایک اونٹ سواری کے لئے اور اونٹنی کا دودھ غذا کے طور پر استعمال کے لیے، ایک تلوار جس سے اپنا دفاع کر سکے۔

ان اشیاء کے علاوہ ذوق کی تسکین کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

دوسرے علاقوں میں شاعر ادیب ہوتا ہے مگر عرب میں وہ ڈاکٹر، روحانی معالج، پیشوا اور ایک دانشور شمار کیا جاتا ہے۔ شاعر اپنے آتشیں کلام سے دشمن کو قتل کرتا، بیمار کے لیے اس کا کلام شفا ہوتا۔

عرب قبائل کی زندگی میں شعر ہوا اور آفتاب کی سی لازمی حیثیت رکھتا تھا اقوام عرب کے خوشی یا غمی، نیک بختی یا بدبختی، شادی یا مرگ، صلح یا جنگ کے مخصوص اشعار ہوتے۔ عرب جب کسی سے متاثر ہوتا زہیر کے اشعار گنگناتا، وحشت کی حالت میں نابغہ کے اشعار

پڑھتا، غصہ وانتقام کے وقت عنتی کے اشعار زبان پر ہوتے، دشمن پر حملہ آور ہوتا تو عترہ کے رجز یہ شعر پڑھتا۔ ہر شخص شاعر نہیں ہوسکتا یہ استعداد خدا کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے۔

ہائے میرے پیارے قارئین! آپ بھی کیا کہتے ہوں گے۔ سیرت رسولؐ کی بات کب شروع ہوگی! پر میں کیا کروں ان سطور سے کیسے گزر جاؤں جو میرے دامن دل کو کھینچ لیتی ہیں۔ مجھے اپنے نبیؐ سے متعلقہ ہر چیز خواہ ان کا ملک ہو یا زبان ہر چیز محبوب ہے۔ پھر آتے ہیں کتاب کی طرف۔

ہر سال مکہ کے بازار میں عکاظ میں عرب شعراء کے مشاعرے ہوا کرتے ۔جو شاعر اپنے کلام میں دوسرے ہم عصروں پر سبقت لے جاتا اسے عرب عوام بہت نوازتے اسے قومی شاعر قرار دیتے ، اس کے شعروں کو ریشمی پارچے میں سنہری حروف میں لکھ کر دیوار کعبہ سے لٹکا دیا جاتا تا کہ جو قبائل مکہ آئیں اسے پڑھیں ۔یہ کلام ایک سال کے لئے وہاں لٹکایا جاتا اور اسے ''اشعار معلقہ'' کہا جاتا۔

ہم لفظ ''امین'' کو ایک معنی میں لیتے ہیں، امانت دار، مگر عرب ''امانت '' کو دو معنوں میں لیتے ہیں۔ ''درستکاری اور وفاداری'' امانت کی صفت کی طرح محمدؐ کا صبر مشہور ہو چکا تھا۔

قارئین! حلف الفضول کا واقعہ ہم بچپن سے سنتے اور پڑھتے چلے آرہے ہیں لیکن کچھ نکات قابل غور ہیں۔حلف الفضول کے معاہدے کے متن کا اقرار کرنے کے بعد قریشی جوانوں (بشمول محمدؐ) نے حجرا اسود کو آب زم زم سے غسل دے کر اس کا پانی پیا تا کہ عہد پختہ ہو جائے ۔ ہاں جس لڑکی کے اغوا کی وجہ سے اس معاہدہ کی ضرورت پیش آئی وہ واقعہ میرے لیے ایک انکشاف تھا۔

بھرپور کوشش میں ہوں کہ اگلے باب کی طرف بڑھ سکوں لیکن میرے لیے یہ کتاب ''سراپا معلومات'' ہے اس زمانے میں نر اونٹ کی قیمت چار صد درہم ،غلام کی قیمت ایک سو پچاس تا آٹھ سو درہم ہوتی تھی۔ غلام کی قیمت کا تعین اس کی جوانی، بڑھاپے، ظاہری صورت کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ نیزے کی قیمت چار درہم اونٹ کا کجاوہ تیرہ درہم ایک روٹی (نان) کی قیمت 1/6 درہم تھی۔صرف مالدار لوگ نان کھاتے عوام کی غذا کھجوریں اور اونٹ کا دودھ تھی۔

ازواج محمدؐ میں سیدہ خدیجہؓ سے شادی کا پس منظر

اور حالات واقعات live پیش کیے گئے ہیں۔رشتہ ناطہ طے ہوتے ہوتے بیچ میں اونٹ آ گئے۔

''اونٹ ایسا جانور ہے جو موسم گرما میں دس دن تک عرب کے گرم صحراؤں میں بغیر کچھ کھائے زندہ رہ سکتا ہے۔ ہم انسانوں کو ایک گھنٹے میں چالیس گرام پسینہ آتا ہے اور ایک یورپی باشندے کو جو صحرا میں زندگی بسر کرنے کا عادی نہ ہو،صحرائے عرب میں چلتے ہوئے ۱۲۰۰ گرام پسینہ یعنی ایک لٹر پسینہ خارج کرتا، اصولاً اگر پانچ فیصد پانی اس طرح بدن سے خارج ہوجائے تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ اگر یہ مقدار دس فیصد ہوجائے تو انسان ہذیان اور تپ شدید سے دوچار ہوجاتا ہے۔ بارہ فیصد ہوجائے تو بے ہوش ہوجاتا ہے اور اسے زندہ رہنے کے لیے کوئی چارہ کارگر ثابت نہیں ہوتا،موت یقینی ہوجاتی ہے۔لیکن...... اونٹ صحرا کی شدید گرمی میں اپنے جسم کا پچیس فیصد تک پانی بھی پسینے کی صورت میں خارج کردے تو اس میں ضعف کے آثار پیدا نہیں ہوتے۔ اسے وزن اٹھانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ بغیر پانی پیئے دس دن اور دس راتیں اپنے مالک کو پیٹھ پر اٹھا کر صحرا میں سفر کرسکتا ہے۔اس دوران بس اتنا کافی ہے کہ اس کا مالک کچھ دیر کو اسے کھلا چھوڑ دے تا کہ وہ کانٹے دار جھاڑیوں سے اپنا پیٹ بھر لے۔ بدوی عرب اونٹ کی اس خو سے اس قدر بہرہ ور ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ صبر وتحمل اور بردباری میں اونٹ بڑھ کر ہے یا وہ عرب جو صحرا میں رہتا ہے اور اونٹوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔''

''محمدؐ جتنی دیر تک صحرا میں رہے ان کی غذا اونٹنی کا دودھ رہی۔ جب کبھی مکہ آتے تو نان وخرما کھالیا کرتے تھے لیکن کبھی دونوں اکٹھے تناول نہیں فرمایا کرتے تھے ایک وقت میں نان کھاتے یا خرما۔ فرمایا کرتے تھے پیٹ بھر کر کھانے کے لئے ایک ہی کافی ہے دونوں کو یکجا کرنا اسراف ہے۔کھانا کھانے کے لئے زمین پر بیٹھا کرتے۔ دسترخوان کھجور کے پتوں سے بنی چٹائی کا ہوتا، جب تک آپؐ سیدہ عائشہؓ کے گھر میں رہے (زندہ رہے مراد ہے) ایک چھلنی بھی نہیں تھی کہ آٹے سے گندم کی بھوسی الگ کرلیتے۔ نان وخرما کے علاوہ ایک اور غذا جو آپؐ کے گھر میں پکا کرتی تھی وہ تھی گندم اور مسور کا ملا جلا پکوان۔ گندم اور مسور کو باہم جوش دے کر ایک قسم کا حلیم تیار کیا جاتا تھا جس دن آپؐ کے گھر میں یہ غذا تیار ہوتی اس دن آپؐ نان وخرما تناول نہ فرماتے۔''

کتاب کے اگلے باب ''گھریلو زندگی'' میں ایک

واقعہ جس کا عموماً تاریخی کتب میں ذکر ملتا ہے کہ حجر اسود کے نصب کرنے پر جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا اور آپ ؐ نے چادر میں حجر اسود کو رکھا، چادر کے کونے معزز قبیلوں کے سرداروں کو پکڑائے، پڑھا ہے لیکن حجر اسود کو نصب کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی، خانہ کعبہ کو کیوں گرانا پڑا، نئی تعمیر کے لئے قریش مکہ کے توہمات اور اژدھے کو عقاب کا جھپٹ کر لے جانا کس طرح خانہ کعبہ کی تعمیر کا باعث بنا۔ بہت خاصے کی چیز ہے۔ ضرور پڑھیئے۔

''غار حرا، کے باب میں عربوں کا عقیدہ کہ شب قدر میں طبیعت استراحت کرتی ہے یا سو جاتی ہے، دریاؤں کی روانی اور ہواؤں کی حرکت تھم جاتی ہے تمام جہاں اس طرح ساکت ہو جاتا ہے کہ انسان غنچے کھلنے کی آواز بھی سن سکتا ہے جنہیں اس شب کا علم ہو جائے اور وہ شب بیداری میں رہیں تو ان کی ہر تمنا کو شرف قبولیت حاصل ہوتا ہے۔ غار حرا سے محمدؐ کے گھر کا فاصلہ ڈیڑھ کلومیٹر ہے۔ یہ غار پتھریلی سلوں کے بیٹھ جانے سے وجود میں آیا ہے۔ اس کی چھت کعبہ رخ ہے، اس میں بیٹھا ہوا آدمی بھی خانہ کعبہ کو دیکھ سکتا ہے (اب آپ کو سمجھ آئی کہ قدرت نے اس غار کا انتخاب کیوں کیا؟ تاکہ بیٹھے ہوئے بھی خانہ کعبہ نظروں کے سامنے رہے۔)

پہلی وحی کے نزول پر جارجیو کا تبصرہ اس قدر بے ساختہ ہے کہ طبیعت تروتازہ ہو جاتی ہے مصنف لکھتا ہے:

''مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح عربوں نے ان آیات کو سننے کے بعد بھی محمدؐ کو پیغمبر تسلیم نہ کیا۔ اس بات کے باوجود کہ محمدؐ رسول اللہ امی تھے۔ اولین آیات قلم و علم، یاد رکھنے، تعلیم دینے کی بابت تھیں۔ کوئی اور دین ایسا نہیں جس میں علم کو اس قدر اہمیت ہو۔ اگر محمدؐ دانشور اور فلسفی ہوتے تو غار حرا میں ان آیات کے نزول پر اس قدر حیران نہ ہوتے۔ کیوں کہ دانشور علم کی اقدار کو سمجھتا ہے۔ آپؐ نے کسی استاد سے درس نہیں لیا تھا فقط ایک بدو عرب کی طرح کلام کی فصاحت اور خوب صورتی کو سمجھتے تھے اور فصاحت کا ادراک کرنا عربوں کی فطرت کا جز تھا۔ میں مسلمانوں کو مبارک کہتا ہوں ان کے دین میں حصول علم کی اس قدر تلقین کی گئی ہے۔ اس سورۃ کی بنا پر حصول علم کو واجبات دین میں سے سمجھا جاتا ہے۔''

اس کے بعد نزول وحی، بعد از وحی آپؐ کی کیفیت کا بھی عقلی دلائل سے جائزہ لیا گیا ہے۔

''ایک انسان کا اللہ کے فرشتے کی آواز سننا، بہت بڑا واقعہ ہے، جب انسان بہت زیادہ دباؤ محسوس کرتا

ہے تو یہی دباؤ خستگی کا باعث بنتا ہے، اور ہر چیز جو آدمی کی استعداد سے باہر ہوا سے تھکا دیتی ہے چاہے خدا کی آواز ہو یا زیادہ سرعت سے گھوڑا دوڑنے کی آواز۔ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے ایسی مشین بنا سکتے ہیں جو ہمیں پرندوں سے زیادہ سرعت سے اٹھا لے جا سکتی ہے لیکن ہمارے عضلات آج بھی یہ استطاعت نہیں رکھتے کہ ہم گھوڑے سے زیادہ تیز دوڑ سکیں۔''

اس کے بعد اس فرشتے کو دیکھ کر آپؐ کی کیفیت کا سائنسی حوالوں سے تجزیہ کیا گیا ہے جو بلاشبہ پڑھنے کے قابل ہے۔

آغاز رسالتؐ یہ وہ باب ہے جس میں الضحیٰ واللیل وما سجیٰ کی بہت حیرت انگیز تفسیر ہے، قرآن پاک کے یک مشت نزول کی بجائے بتدریج پر روشنی ڈالی گئی ہے لکھتے ہیں کہ 6219 آیات ایک ہی دفعہ نازل کر دی جاتیں تو اس دور کے افراد جو سادہ ان پڑھ اور بے علم تھے چکرا کر رہ جاتے اور کچھ نہ سمجھ پاتے۔

کتاب کا وہ باب جو سابقین کے عنوان سے ہے تمام سابقون الاوّلون کی قبل از اسلام اور بعد از اسلام کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ اسلام کی پہلی دعوت دیتے وقت آپؐ کے سامنے کون سے خدشات تھے۔

''محمدؐ نے عبدالمطلب کے تمام فرزندوں کا جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ابوطالب بوڑھے اور ضعیف ہیں، ابولہب تاجر ہیں، حمزہ پہلوان اور عباس سود خور ہیں۔ ان کا مذہب سے تعلق اپنی دنیوی منفعت تک محدود تھا محمدؐ جانتے تھے ان میں سے کوئی بھی کلام حق سننے پر آمادہ نہ ہوگا (ان سب کی مجبوریاں یا حق سے انکار کی وجوہات کتاب میں مفصل موجود ہیں) اس باب میں ان سب منکرین حق کے لئے کیا ثابت کیا گیا ہے۔

''محمدؐ بدوی عربوں کی طرح راسخ العقیدہ سمجھے جاتے تھے۔ بدوی عرب یورپین نہیں کہ نظریے (Ideology) کا محتاج ہو۔ یورپ کے لوگ یونان روم سے تمدنی رشتہ کے باعث نظریے کی عادت میں مبتلا ہیں ایک یورپین کے ذہن میں ممکن ہے کئی افکار سما سکیں مگر بدوی عرب کے ذہن میں بیک وقت کئی افکار جگہ نہیں پکڑ سکتے۔ جب اس کے ذہن میں ایک عقیدہ جاگزیں ہو جائے تو اس عقیدہ کا ذہن سے نکلنا محال ہے الا یہ کہ قوی تر اور موثر تر عقیدہ سامنے لایا جائے۔'' اس باب میں اس بات کو حق سچ ثابت کرنے کے لیے عرب شاعر شنفرہ کا حیرت انگیز واقعہ موجود ہے۔

لیجیے قارئین! اختتام درپیش ہے لیکن چالیس

ابواب کی اس کتاب میں سے صرف سات پر ''تانکا جھانکی'' ہی پیش کرسکی۔ معذرت خواہ ہوں سیرت کے اصل موضوعات مثلاً

شعب ابی طالب

عمر بن خطاب کا قبول اسلام

معراج کی علمی توضیح

جنگ بدر اور محمدؐ کی جنگی تکنیک

جنگ احد میں مجاہدین اسلام کی اشاعت سے لے کر ''رسولؐ اللہ مرض الموت میں اور ارتحال تک کے ابواب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اثر انگیزی میں دوسرے سے کم ہو۔ مجھے فتح مکہ کے بارے میں کتاب کی ہر سطر میں بیش بہا معلومات ملیں۔ کتاب کا اختتام ملاحظہ کریں۔

''بروز سوموار بتاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ ھجری ۸ جون ۶۳۲ء علی ابن طالب، چچا عباس کا لڑکا فضل، اسامہ بن زید، شقران آپؐ کا ایک آزاد کردہ غلام، اوس بن خولی اور تمام ازواج مطہرات موجود تھیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ان دنوں میں جوان تھی سمجھ نہ سکی میرے شوہر اس جہاں سے رخصت ہونے والے ہیں۔ میں نے دونوں بازوؤں سے ان کے اردگرد حلقہ کیا ہوا تھا اسی حالت میں آپؐ نے رحلت فرمائی، میں نہ سمجھ سکی آپؐ رخصت ہو چکے ہیں جب عورتوں نے آہ وشیون کی، مرد رونے لگے تو مجھے احساس ہوا کہ پیغمبر اسلامؐ اس جہاں سے تشریف لے جا چکے ہیں۔ جس لحظہ آپؐ کی وفات ہوئی ایک روایت کے مطابق مہر نبوتؐ جو پشت پر دونوں شانوں کے درمیان تھی معدوم ہوگئی۔ محمدؐ اہل مکہ تھے مگر کہ مدینہ میں وفات پائی۔''

عزیز و اقارب حیران تھے کہ قبر مکہ کی رسم کے مطابق ہو یا مدینہ کی طرز پر کھودی جائے۔ مکہ میں قبر عمودی رکھتے ہیں۔ مدینہ میں عمودی رکھ کر پھر بغل میں کھدائی کی جاتی ہے۔

سب نے کیا فیصلہ کیا تدفین کیسے ہوئی؟؟

کتاب خریدیئے، کتاب پڑھیئے، اچھی کتاب پڑھانا بھی صدقہ جاریہ ہے اور صدقہ جہنم سے آڑ ہے۔

دعاؤں میں یاد رکھیے۔ فی امان اللہ

☆☆☆

ربیعہ ندرت

کس نام سے پکاروں

کتاب تکمیل کے آخری مراحل میں تھی اور میں اس کے لیے کسی موزوں نام کی تلاش میں تھی۔ قدرے سوچ بچار کے بعد مجھے تین نام پسند آئے۔

ہمیں صحرا عبور کرنا ہے

محبت نام ہے جس کا

برگد تلے

مجھے تینوں نام بھلے لگ رہے تھے اور میرے لیے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب مشکل تھا۔ اسی دوران میری ایک سہیلی جو ماہرِ امراض قلب ہے، مجھ سے ملنے کے لئے آئی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس سے بھی مشورہ کرلیا جائے۔ میں نے اسے تینوں نام بتا کر اس کی رائے طلب کی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے کہنے لگی۔

''بھلا ایک ڈاکٹر کا کیا کام کہ وہ اس بارے میں رائے دے سکے۔''

میں نے کہا'' بھئی ان سب ناموں کا دل کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے۔ سو تم سے پوچھنا ضروری ٹھہرا۔''

اس نے حیرت سے کہا'' بھلا صحرا عبور کرنے کا دل سے کیا تعلق ہے؟''

میں نے کہا'' زندگی کے سفر کا ایک لمحہ بھی دل کے بغیر نہیں چل سکتا۔ ادھر دل نے چلنے سے انکار کیا، ادھر زندگی جامد ہوگئی۔ تو پھر صحرا کا سفر کیسے دل کے بغیر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی صحرا کا سفر اور دل دونوں لازم وملزوم ٹھہرے۔ دل ہوگا تو صحرا عبور کریں گے۔ دل نہ ہوگا تو کون سا مسافر، کیسا مسافر اور کیسا صحرا۔''

وہ کہنے لگی'' لیکن یہ نام مجھے نامناسب لگتا ہے۔ کیونکہ اس مصرعے میں حصر ہونے کا سا انداز ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہنے والا بضد ہے کہ ہم نے صحرا عبور کرنا ہے، ہر حال میں کرنا ہے، ضرور بالضرور کرنا ہے۔ اس ضمن میں جملہ ناصحین وواعظین نے جو کرنا ہے وہ بے شک کر گزریں، ہم بہر حال رکنے والے نہیں۔ اب یہ تو بالک ہٹ ہوئی نا۔ اس کا تو کوئی علاج نہیں۔ ڈاکٹر بے چارے کیا کریں۔ اس کے علاوہ اس عنوان کو سن کر سامع کے دل میں خواہ مخواہ مخالفت کا جذبہ بیدار ہوجاتا ہے کہ بھئی تمہیں کیا کسی باؤلے کتے نے کاٹا ہے

کہ اچھی بھلی آرام و آسائش کی زندگی کو تج کر کے اب تم نے صحرا عبور کرنے کی ٹھان لی ہے۔ حالانکہ

ایں خیال است ومحال است وجنوں

پھر صحرا عبور کرنا بچوں کا کھیل نہیں بلکہ یہ تو جوانمردوں کا کام ہے۔ اب اگر انسان جوان بھی نہ ہو اور مرد بھی نہ ہو تو پھر ایسا ارادہ کیونکر کرے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر اگر انسان صحرا عبور کرنے کیلئے نکل بھی جائے تو غالب امکان اس بات کا ہے کہ وہ صحرا عبور کرنے کی بجائے زندگی کی حد کو عبور کر جائے گا۔ اس صورت میں لواحقین کو اس کی کوئی نشانی ہرگز دستیاب نہ ہوگی کہ جنازہ اٹھایا جائے یا مزار بنایا جائے۔ ایسی صورتحال میں نہ دشمن وہاں بخوشی فاتحہ پڑھ کرنیکی کمائیں گے اور نہ ہی دوست دل کا غبار نکالنے کے لئے آکر دو آنسو بہا کر ہلکے پھلکے ہوں گے۔ یعنی نہ اپنی ذات کو نفع ہوگا، نہ دشمن کا بھلا ہوگا اور نہ دوست کی خیر۔ پھر بھلا اتنے پاپڑ بیلنے کا کیا فائدہ؟ جبکہ متعلقہ فریقین یقینی خسارے کی لپیٹ میں آجائیں گے؟''

میں نے کہا،

''تو کیا ''محبت نام ہے جس کا'' کتاب کے لیے بہتر ہوتا۔''

وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی،

''تم یہ نام رکھنا چاہتی ہو تو رکھ لو۔ ورنہ آج کل کی دنیا میں آپس کے تعلق کی وجہ محبت نہیں بلکہ ضرورت ہے۔ جس کی ضرورت ہو، اس سے تعلق قائم کر کے اسے استعمال کرلو۔ حاجت باقی نہ رہے تو تعلق ختم کر ڈالو۔ اور پھر محبت میں دل نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ سب قصے ہیں۔ سب کہانیاں ہیں۔''

میں نے کہا،

''میرا خیال ہے کہ جب تک دنیا قائم رہے گی، محبت زندہ رہے گی۔ ہاں محبت کا چراغ صرف خلوص اور خونِ جگر کے ایندھن سے جلتا ہے اور خودغرضی اور انا پرستی کی نفرت انگیز زہر آلود بادِ مخالف سے بجھ جاتا ہے، اور محبت میں تو سارا کھیل ہی دل کے دم قدم سے ہے اگر دنیا سے دلنوازی، دلبری، دل آرائی، دل ربائی، دل آویزی، دل پذیری، دل کشائی، دلجوئی، دلداری اور دل گرفتگی وغیرہ اٹھ جائیں گی تو محبت کا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔ تمہارا المیہ یہ ہے کہ دل کی چیر پھاڑ کر کے تم ظاہری آنکھوں سے اس کی شکل، اس کا عمل، ممکنہ خرابیوں کے ظہور اور ان کے سدِ باب کا باریک بینی سے جائزہ تو لیتے ہو لیکن اس کے اندر چھپے ہوئے جذبات کی

دنیا اور احساسات کی وادی کے اندر نہیں جھانکتے۔ بھئی محبت کے عمل میں تو دل ہی کی کارفرمائی پوشیدہ ہے۔ دل ہی رہبر، دل ہی رہزن، دل ہی محرم، دل ہی مجرم، دل ہی مسرور، دل ہی مسحور، دل ہی مغموم، دل ہی شاد، دل ہی آباد۔ محبت کے شعبے میں سے اگر دل کو نکال دیا جائے تو محبت اس سے جدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔''

اس نے کہا''تمہاری یہ بات کسی حد تک مانی جاسکتی ہے لیکن اب بتاؤ کہ برگد میں دل کہاں سے دھڑکنے لگا۔''

میں نے کہا''بھئی اگر برگد تلے سخت سردی کے موسم میں بیٹھیں گے تو مارے سردی کے دل پر بھی کپکپی طاری ہو جائے گی اور وہ پریشان ہوگا۔ اگر گرمی کے موسم میں بیٹھیں گے تو وہ بے چین ہو جائے گا۔ حبس کے موسم میں بیٹھیں گے تو گھبراہٹ کا شکار ہوگا۔ بہار کے موسم میں بیٹھیں گے تو دل شاد ہوگا اور اگر کبھی نہیں بیٹھیں گے تو دل کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس لیے برگد تلے بیٹھنے کے لئے بھی دل کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر وہ نہیں ہوگا تو زندگی نہیں ہوگی اور اگر زندگی نہیں ہوگی تو برگد تلے کیونکر اور کاہے کو بیٹھیں گے۔''

وہ کہنے لگی''میرے نزدیک تو دل کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ وہ سارے جسم کو بلا تعطل خون کی فراہمی کرتا چلا جائے۔ اس کے علاوہ باقی تو سب کہانیاں ہیں۔''

میں نے کہا''سردست تم مجھے یہ بتاؤ کہ مذکورہ بالا تینوں ناموں میں سے کتاب کے لئے کون سا نام موزوں ہے۔''

وہ کہنے لگی''سچ پوچھو تو میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔''

میں نے کہا''میں نے سن رکھا تھا کہ صرف عاقل اور عالم ہی اپنی فہم وفراست سے کام لے کر مسئلہ حل کر کے کسی حتمی نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔ یہ کسی ہما شما کے بس کی بات نہیں۔ آج میں اس قول کی صداقت کی قائل ہوگئی ہوں۔''

وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی''میں نے بھی جو سنا تھا، آج اس کو سچ پایا کہ صرف ایک عاقل ہی عالم سے رہنمائی کا طلبگار ہوتا ہے اور عالم کی پہچان کسی احمق اور نادان کے بس کی بات نہیں۔''

☆☆☆

جاوید کی واپسی

شادی کے بعد جب الگ گھر میں رہنا پڑا تو محسوس ہوا کہ بڑے گھر کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ گیٹ پر بیل ہو اور آپ کو سب کام چھوڑ چھاڑ گیٹ پر جانا پڑے یہ دیکھنے کے لیے کہ کس نے بیل کی ہے۔ ڈرائیور سے کہا کہ کوئی چھوٹا لڑکا لاؤ جو گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کر لے اور گیٹ پر بیل بھی اٹینڈ کر لے۔ ہفتے کے بعد ڈرائیور ایک خستہ حال بارہ تیرہ سال کا لڑکا لایا۔ پرانے کپڑے، پھٹے ہوئے جوتے، نین نقش خوبصورت مگر فاقوں کی وجہ سے چہرہ سوکھا ہوا، رنگ جلا ہوا ''باجی یہ ہمارے گاؤں کا ہے، باپ فوت ہو چکا ہے۔ دو بہنیں بڑی ہیں اور دو چھوٹی ہیں، چھوٹے ہونے سے ہی یہ محنت مزدوری کر رہا ہے۔'' ڈرائیور نے بتایا۔

''کیا نام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی جاوید'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

''چلو پہلے میں تمھیں کپڑے اور جوتے دیتی ہوں نہا کر پہن لو۔'' میں نے جاوید سے کہا۔

بیٹے کے کپڑے اور جوتے اسے دیے اور باہر کا غسل خانہ بتا دیا۔ نہا کر جب وہ آیا تو شکل کافی بہتر لگ رہی تھی۔ ''ہم نے تو کسی کے گھر جانا ہے تم روٹی بنا سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جی میں نے اپنی امی کو پکاتے دیکھا ہے میں کوشش کر لیتا ہوں۔''

''چلو ٹھیک ہے تم آٹا گوندھ کر روٹی بنا لو میں تمھیں سالن نکال دیتی ہوں۔''

میں نے سالن نکال کر فرائی پین میں ڈالا ''روٹی پکا کر سالن گرم کر کے کھا لینا۔ ہمارے آنے تک تم سٹول لے کر گیٹ کے پاس بیٹھ جانا۔''

بچے اسکول سے آئے انھیں جلد تیار ہونے کے لیے کہا خود باورچی خانے میں گئی۔ پلیٹ میں روٹیوں کی ٹیشی تھی جس میں کم از کم نو دس موٹی موٹی کچی پکی روٹیاں تھیں اور پرات آدھی سے زیادہ گندھے ہوئے آٹے کی پڑی تھی اور جاوید سالن گرم کر رہا تھا۔

''جاوید ہم نے تو جہاں جانا تھا وہیں کھانا بھی کھانا تھا تم نے ہمارے لیے کاہے کو پکا دیں۔'' میں نے

پریشان ہوکر پوچھا۔ بھلا اس طرح کی روٹی کون کھا سکتا ہے۔

''جی میں نے تو اپنے لیے بنائی ہیں۔'' اس نے آرام سے جواب دیا۔

خدایا یہ نو دس روٹیاں کھائے گا، کیا یہ اتنا فاقے کا مارا ہوا ہے۔ ''آٹا تو اتنا زیادہ نہیں گوندھنا تھا۔'' میں نے پریشانی سے کہا۔

''جی کبھی وہ پتلا ہو جاتا تو میں آٹا ڈال دیتا پھر وہ سخت ہو جاتا تو پانی ڈالنا پڑتا۔'' یہ جواب ملا۔

میں نے پرات اسی طرح فرج میں رکھ دی اور بیڈ روم میں آ گئی۔ ''اللہ میاں اگر اس نے یہ نو دس روٹیاں کھا لیں تو کہیں اس کا پیٹ خراب نہ ہو جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ڈسٹ بن میں پھینک دے۔ مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال خود بھی تیار ہوئی اور بچوں کو بھی تیار کروایا پھر دوبارہ باورچی خانے میں گئی جاوید ابھی تک باورچی خانے میں ہی تھا کوئی روٹی نظر نہ آ رہی تھی۔ وہ نلکا کھولے برتن دھو رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ڈسٹ بن دیکھی وہ خالی تھی۔ فرج کے پیچھے بھی نظر دوڑائی وہاں بھی کچھ نہ تھا۔

''جاوید تم یہ سٹول لے کر باہر بیٹھ جاؤ میں گھر بند کر کے بچوں کے ساتھ جا رہی ہوں گھر کا دھیان رکھنا۔''

میں دل میں دعائیں کرتی ڈرائیور کے ساتھ چلی گئی کہ یہ کچی پکی جلی ہوئی روٹیاں اسے ہضم ہو جائیں۔ شام کو ہم لیٹ آئے۔ جاوید گیٹ پر ہی بیٹھا تھا۔ ''جاوید تم کھانا کھا لو ہم تو نہیں کھائیں گے کھانا دیر سے ملا تھا۔''

''جی بس ایک مرتبہ کھا لیا اب کل کھاؤں گا۔'' اس نے سٹول اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اسے کھانا بھی نہیں چاہیے۔ صبح ناشتہ میں نے خود بنایا۔ پہلے سوچا کہ اسے ڈبل روٹی دے دوں پھر خیال آیا نہ معلوم ڈبل روٹی سے اس کا پیٹ بھرے گا یا نہیں۔ میں نے کل والی پرات نکال کے اسے دی۔

''چائے پیتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں'' جواب ملا۔

میں نے سالن نکال کر اُسے دیا اور ٹرالی کھینچ کر کھانے والے کمرے میں لے گئی۔ جس بچے نے جو کھانا تھا کھلایا اور سکول روانہ کیا۔ دل میں مسلسل جستجو سی تھی کہ دیکھوں جاوید نے کتنی روٹیاں بنائی ہیں۔ بہانے سے باورچی خانے میں گئی۔ پرات خالی تھی اور پانچ چھ موٹی موٹی روٹیاں بنی ہوئی تھیں اور وہ سالن گرم

کر رہا تھا۔

''جاوید ٹرالی باورچی خانے میں لے آنا اور برتن دھو چھوڑنا۔''

''بہتر'' جواب ملا۔

میں واپس آ گئی چلو پانچ چھ تو ہضم ہو ہی جائیں گی ۔میں کچھ کچھ مطمئن تھی۔ دوپہر کو میں نے تو بچوں کے لیے چاول بنا لیے۔ جاوید کو روٹی کا کہہ دیا۔ اب یہ حال کہ کمرے میں دل ہی نہ لگے۔ یہی دل چاہے کہ دیکھوں آج کتنی پکائی ہیں۔ گیٹ پر بیل ہوئی میں جلدی سے باورچی خانے میں گئی۔ ''جاوید دیکھو باہر کون ہے؟'' جونہی وہ باہر نکلا میں نے روٹیوں کی ٹیشی گنی۔ سات روٹیاں تھیں۔ اتنی دیر میں جاوید آ گیا۔

''جی یہ خط آیا ہے۔''

اس نے پکڑایا میں بیڈ روم میں آ گئی۔ ایک ہفتہ یہی آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ جونہی جاوید روٹیاں بناتا میں بہانے سے اُسے باہر بھیج کر گنتی مگر میں نے دیکھا کہ آہستہ آہستہ روٹیوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی اور ان کی شکل بھی بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ اس دن تو میں حیران رہ گئی جب جاوید کی پلیٹ میں صرف تین روٹیاں تھیں اور اس نے مجھے کہا تھا۔ ''باجی آپ سالن بہت زیادہ دیتی ہیں مجھ سے اتنا کھایا نہیں جاتا۔'' اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ اس کی بھوک ختم ہو گئی ہے اور یہ نارمل ہو گیا ہے۔

چند ہی ہفتوں میں میں نے محسوس کیا کہ جاوید ہر کام بہت شوق سے سیکھتا بھی ہے اور اسی طرح کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ رنگ بھی نکھرتا جا رہا تھا اور صورت بھی خوب اچھی ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن دوپہر کا کھانا کھا کر نماز پڑھ کر لیٹی ہی تھی کہ بیٹا آیا اور کہا۔

''امی باورچی خانے میں جاوید آپ کو بلا رہا ہے۔''

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔''

اور وہ باہر نکل گیا میں باورچی خانے میں گئی وہ سٹول پر بیٹھا تھا مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

''آج شب بارات ہے۔'' بولا۔

''تو کیا؟'' مجھے سمجھ نہ آئی۔

''آج حلوہ بنا کر سارے گھروں کے کوارٹروں میں دیں گے۔''

''مجھے تو بنانا نہیں آتا سعیدہ باجی سے پوچھ کر

تمھیں بتاتی ہوں تم بنا کر سب کو دے دینا۔''

باجی سے پوچھا۔ ''بھئی جتنی سوجی ہو اتنی چینی۔ پہلے گھی میں پانچ چھ سبز الائچیاں کھول کر ڈالو پھر سوجی ڈال کر بھون لو۔ جب خوشبو آنی شروع ہو جائے، سوجی ہلکی براؤن ہو جائے تو چینی ڈال کر اندازے کا پانی ڈال کر پکا لو۔ اتارنے سے پہلے بادام، پستہ وغیرہ باریک کر کے ڈال لو۔'' میں نے یہی کہانی جاوید کو سنائی اور پانچ سو روپے دیے کہ بازار سے چیزیں لا کر بنا لے اور خود جا کر سو گئی۔ سو کر اٹھی تو عصر کی نماز پڑھی۔ ایک سپارہ پڑھا اتنے میں بچے بھی سو کر اٹھ چکے تھے وہ میرے کمرے میں آئے۔ ان کے لیے دودھ اور اپنے لیے چائے بنانے باورچی خانے میں گئی۔ اندر داخل ہوئی تو سکتہ سا ہو گیا۔ ایک بڑا پتیلا چولہے پر نیچے دھڑا دھڑ آگ، اندر پتلی سی سوجی جو ابل ابل کر فرش پر چھینٹے بکھیر رہی تھی اور جاوید سہما ہوا کونے میں کھڑا تھا۔ سب سے پہلے تو جلدی سے آگ بند کی اور خود دروازے کے قریب کھڑی ہو گئی۔ آہستہ آہستہ چھینٹے ختم ہوئے تو پتیلا حلوے سے بھرا ہوا تھا۔

''جاوید سوجی کتنی تھی اور پانی کتنا ڈالا تھا۔'' میں سخت پریشان تھی۔

''جی سوجی تو ایک کلو تھی، پانی آپ نے اندازے کا بتایا تھا وہ میں نے ڈالڈے کے بڑے دو ڈبے ڈال دیے تھے۔''

خدایا چھوٹی سی لاپروائی کا یہ نتیجہ! اگر میں اندازہ بھی بتا دیتی تو یہ حشر نہیں ہونا تھا۔ دو پتیلے اور نکالے۔ پتلی سوجی کو ان پتیلوں میں ڈالا اور سب کے نیچے آگ لگا کر کوئی دو گھنٹوں میں پانی سکھایا۔ پھر جاوید ہی سے پچاس ساٹھ نان منگوائے اور اسے کہا کہ سارے گھروں کے کوارٹروں میں دے آؤ۔

وقت گزرتا جا رہا تھا جاوید نے تقریباً تمام کام ہی سنبھال لیے تھے۔ باورچی خانے میں وہ اتنی خاموشی سے کام کرتا کہ بعض مرتبہ جا کر دیکھنا پڑتا کہ وہ اندر ہے بھی یا نہیں۔ نہ کوئی گلاس ٹوٹتا نہ پلیٹ، نہ چمچ گم ہوتے نہ چھریاں چھلکوں کے ساتھ ڈسٹ بن میں پھینکی جاتیں، سائیکل اسے لے دی تھی باہر کے سودے بھی وہی لاتا۔ کبھی انڈا نہ ٹوٹا نہ کبھی حساب میں غلطی ہوئی۔

اسی طرح تیرہ سال گزر گئے۔ بچے کالجوں میں پہنچ گئے۔ جاوید کی میں نے شادی بھی کر دی۔ شادی اس کی خالہ کی بیٹی سے ہوئی خیال تو تھا کہ بیوی ہمارے پاس ہی آ جائے گی مگر جاوید نے بتایا کہ آزاد کشمیر کا

رواج ہے کہ عورتیں اپنا گاؤں نہیں چھوڑتیں۔ تقریباً ہر دوسرے تیسرے مہینے وہ ایک ہفتے کے لیے چلا جاتا اور میں بھی اسے جانے دیتی کہ چلو باقی ہفتے تو آرام سے گزرتے ہیں۔

اس دفعہ جب یہ کشمیر سے واپس آیا تو میں نے محسوس کیا کہ جاوید کچھ زیادہ ہی چپ چپ ہے۔ پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کا ایک چچا کویت میں ہے اس نے کہا ہے کہ جس کمپنی میں وہ کام کرتا ہے وہاں خانسامے کی ضرورت ہے۔ تنخواہ بھی معقول ہے وہ آ جائے۔ ظاہر ہے میں تو اتنی تنخواہ نہیں دے سکتی تھی چنانچہ اسے اجازت دے دی۔ وہ مجھ سے تنخواہ کے علاوہ بیس ہزار ادھار لے کر گھر چلا گیا اور یہ کہہ گیا کہ جب تنخواہ ملے گی وہ کسی آتے جاتے کے ہاتھ پیسے بھجوا دے گا۔ بہت عرصہ مجھے جاوید بہت یاد آتا رہا۔ شروع میں تو جو کام بھی کرنا پڑتا وہ زیادہ ہی یاد آتا۔ اس دوران بہت سے نوکر آئے بھی اور گئے بھی۔ برتن بھی خوب ٹوٹنے شروع ہو گئے۔ چھریاں چمچ بھی غائب ہونے لگے۔ سودے میں سے پیسے بھی مارے جانے لگے۔ اور بہت سال گزر گئے اس دوران کوئی آدمی بھی ایسا نہ آیا جو جاوید کا قرضہ لاتا۔ بچوں کی شادیاں ہو گئیں۔ ان کے بچے بھی سکولوں میں پہنچ گئے۔ میں کبھی بیٹے کے گھر کبھی بیٹی کے پاس جس کو میری جب ضرورت ہوتی میں کپڑے اٹھاتی اور اسی کی ضرورت پوری کرنے پہنچ جاتی۔

جب میرا داماد سعودی عرب چلا گیا تو پھر مجھے مستقل بیٹی کے پاس رہنا پڑا۔ ایک دن بیل ہوئی۔ کام والی چھوٹی لڑکی میرے پاس آئی۔ ''آپ کو کوئی باہر بلا رہا ہے۔''

''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں کوئی سفید سا داڑھی والا آدمی ہے، ہاتھ میں موبائل ہے۔ سفید کپڑے ہیں، چمکدار جوتے ہیں۔'' اس نے تفصیل سے حلیہ بتایا۔

''پہلے نام پوچھو پھر یہ پوچھو کہ کام کیا ہے۔''

تھوڑی دیر کے بعد آئی۔ ''جی وہ کہتے ہیں کام تو کچھ نہیں صرف آپ سے ملنا تھا اور نام جاوید بتایا ہے۔''

جو حلیہ اس نے بتایا تھا اس سے مجھے سوچنا پڑا کہ یہ کون سا جاوید ہوگا۔ بہرحال میں گیٹ کے قریب گئی۔

اس آدمی نے جھک کر سلام کیا۔ آواز سے میں فوراً پہچان گئی کہ یہ کون ہے۔ جاوید کو دیکھ کر مجھے بہت

ہی خوشی ہوئی۔ ''تمھیں اس گھر کا پتا کس نے بتایا؟ تم پاکستان کب آئے؟ اتنے سال کہاں رہے؟ کتنے بچے ہیں؟''

میں نے اس سے بہت سے سوال اکٹھے کر دیے اور اسے لے کر برآمدہ میں ہی چلی گئی۔ میں کرسی پر بیٹھ گئی وہ کچھ دیر کھڑا ہی رہا۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کہا۔

وہ بیٹھ گیا پھر اس نے بتایا کہ گھر کا تو پتا اس طرح لگا کہ پہلے وہ ہمارے آبائی گھر گیا وہاں پرانا نوکر ہی کام کرتا ہے جو جاوید کے گاؤں کا ہی ہے اس نے صائمہ کے گھر کا بتایا اور پاکستان پکا وہ تب آیا جب زلزلہ آیا اور اس کا گھر بالکل تباہ ہو گیا۔ اللہ نے بیوی بچوں کو تو بچا لیا وہ اس وقت کسی رشتہ دار کے گھر گئے ہوئے تھے مگر ماں اس حادثے میں فوت ہو گئی۔ پھر وہ اسی جگہ محنت مزدوری کرتا رہا۔ گھر کھڑا تو ہو گیا ہے مگر مکمل نہیں ہوا۔ اب اس نے فیصلہ کیا ہے کہ لاہور نوکری کرے گا اور گھر خرچہ بھی بھیجے گا اور اس کی مرمت بھی کروائے گا۔

بچے چار ہیں جو سکول میں پڑھ رہے ہیں۔ اس کی بات سنی تو سوچ میں پڑ گئی۔ بیٹی کے تو کام والے پورے تھے اسے وہاں تو رکھا نہیں جا سکتا تھا۔ البتہ بیٹے نے صائمہ کے ساتھ والا گھر خرید لیا تھا مگر ابھی وہ امریکہ سے واپس نہیں آیا تھا۔ اس کا پروگرام تو یہ تھا کہ بچے اور بیوی مستقل پاکستان میں رہیں خود وہ امریکہ ہی نوکری کرے اور آتا جاتا رہے۔

''جاوید تمھیں گاڑی چلانی آتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی آتی تو نہیں مگر میں سیکھ لوں گا......'' کچھ دیر ٹھہر کر آہستہ سے بولا۔

''آپ مجھے جو مرضی تنخواہ دے دیں میں اب پھر آپ لوگوں کے پاس ہی کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں سب کچھ کر لوں گا۔ کھانا بھی بنا لیا کروں گا۔ گاڑی بھی چلانی سیکھ لوں گا۔ آپ مجھے رکھ لیں۔'' اس نے التجا کی۔

''جاوید تمھیں تو پتا نہیں ہو گا کہ صائم اور اس کی بیوی بچے امریکہ میں ہیں یہ ساتھ والا گھر صائم نے خرید لیا ہے۔ دو ماہ تک گھر والے گھر چھوڑ دیں گے تو صائم بیوی بچوں کو لے کر آ جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کے لیے کوئی قابلِ اعتبار ڈرائیور ہو تم اس دوران گاڑی چلانی سیکھ لو۔ اپنا سیل نمبر مجھے دے دو جونہی گھر خالی ہوا صائم وغیرہ آ جائیں گے میں تمھیں اطلاع دے دوں گی تم آ جانا۔''

اتنی دیر میں لڑکی جاوید کے لیے روح افزا بنا لائی۔ جتنی دیر میں وہ روح افزا پی رہا تھا میں اندر سے کچھ ہزار روپے لے آئی جو اسے دیے کہ وہ گھر کی کوئی چیز بنالے۔ وہ موبائل نمبر دے کر خوشی خوشی چلا گیا۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ صائم کو امریکہ فون کیا اور یہ خوشخبری سنائی کہ جاوید واپس آ رہا ہے۔ ''امی آپ نے اسے ابھی رکھ لینا تھا۔'' صائم بہت خوش تھا۔

''پہلے ہی اتنے کام والے یہاں ہیں ایک اور کا اضافہ کاہے کو کرلوں۔ جب تم آ ؤ گے تو میں اسے بلا لوں گی۔'' میں نے جواب دیا۔

پورے دو ماہ کے بعد صائم کا گھر خالی ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے دونوں گھروں کی دیوار نکلوائی۔ اب اندر سے دونوں گھر ایک ہو گئے۔ سفیدیاں کروائیں، کھڑکیوں کو پالش کروایا۔ ادھر صائم امریکہ سے روانہ ہوا ادھر میں نے جاوید کو فون کر کے لاہور بلا لیا۔ چند دنوں میں گھر سیٹ ہو گیا۔ صفائی، کپڑے دھونے، استری کرنے یہ کام تو صائمہ کی ماسیوں نے ہی سنبھال لیے۔ باورچی خانہ جاوید نے سنبھال لیا۔ میں نے دیکھا کہ روزانہ جب جاوید باورچی خانے میں آتا تو کپڑے بدلے ہوئے استری شدہ، پالش کی ہوئی چپل، کنگھی پٹی کی ہوتی۔ باورچی خانے میں گھستے ہی ایپرن باندھتا پھر کام شروع کرتا۔ سارا دن ایپرن بندھا رہتا۔ سوائے اس وقت اترتا جب اس نے نماز پڑھنے مسجد جانا ہوتا۔

ایک دن میں نے ATM سے پیسے نکلوانے تھے۔ ''جاوید تم اب گاڑی چلا لیتے ہو نا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی'' اس نے بہت اعتماد سے جواب دیا۔

''تو چلو ذرا بنک تک چلتے ہیں۔ میں نے پیسے نکلوانے ہیں۔''

میں تو برقعہ پہننے کمرے میں آئی جب میں واپس باورچی خانے میں گئی تو جاوید غائب۔ میں سمجھی شاید گاڑی نکالنے چلا گیا ہے میں پورچ میں گئی گاڑی کھڑی تھی میں دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی اور جاوید کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ کافی دیر ہوگئی تو میں نے زور سے ہارن بجایا۔ تھوڑی دیر کے بعد جاوید تیز تیز قدموں سے گاڑی کی طرف آ رہا تھا۔ واہ کیا شان!! سفید براق استری کیے ہوئے کپڑے، چمکتے بند جوتے، نئے سرے سے کنگھی کی ہوئی اور آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پہلے دو ہارن دیے۔ باہر جو چوکیدار بیٹھا تھا اس نے فوراً

گیٹ کھول دیا۔ یہ گاڑی نکال کر باہر آ گیا مگر جس طرح اس نے گاڑی نکالی مجھے فوراً سمجھ آ گئی کہ ابھی یہ اس قابل نہیں کہ بچوں کو اس کے ساتھ بھیجا جائے اور شاید مجھے بھی ابھی بیٹھنا نہیں چاہیے تھا مگر صرف اس لیے کہ اس کا اعتماد نہ ختم ہو جائے میں بیٹھی رہی۔ وہ بسم اللہ بسم اللہ کہتا ہوا گاڑی چلانے لگا، آگے پیچھے، دائیں بائیں جو بھی سواری گزر رہی تھی مجھے یہی لگتا تھا کہ ابھی ٹکرائی کہ ٹکرائی۔ اب جاوید تو بسم اللہ بسم اللہ اونچی اونچی پڑھ رہا تھا اور میں سر جھکائے لا الہ الا اللہ پڑھ رہی تھی۔ بنک ہمارے گھر سے تقریباً تین یا ساڑھے تین منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ وہ سفر کتنا لمبا لگ رہا تھا اور میرے دل کا کیا حال تھا یہ صرف میں یا میرا اللہ ہی جانتے تھے۔ اچانک زور سے بریک لگی اور گاڑی جھٹکے سے رُکی اور جاوید نے زور سے ''شکر الحمدللہ'' کہا تو میں نے دھڑکتے دل سے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ ''مسلم کمرشل بنک ATM'' کا بورڈ سامنے ہی تھا۔ میں خشک گلے اور خشک ہونٹوں کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کرتی ATM کے کمرے میں گئی اور کارڈ مشین میں ڈالا۔ خوف کے مارے یہ حال کہ pin ہی بھول گیا۔ اب سوچنے لگی وہ نمبر کیا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یاد آ جائے تو یاد آیا کہ جب Debit card (ڈیبٹ کارڈ) بنوایا تھا تو بیٹے نے مشورہ دیا تھا کہ ''امی آپ اپنی Date of birth (تاریخ پیدائش الٹا کر کے پن نمبر بنوا لیں وہ آپ کو بھولے گا نہیں چاہے آپ جتنے مرضی وقفے کے بعد پیسے نکلوائیں۔'' یہ بھی اللہ کا کرم تھا کہ یہ بات یاد آ گئی ورنہ جو میرا حال تھا مجھے یہ بات بھی یاد نہیں آنی تھی۔ اب پیسے تو نکلوا لیے دل یہی چاہے کہ جاوید کو کہوں کہ وہ تو گاڑی لے کر گھر چلا جائے میں رکشہ لے کر آ جاؤں۔ پھر خیال آیا اگر آج کی رات قبر میں آنی ہے تو وہ تو رکشے کی وجہ سے بھی آ جائے گی، اور دعائیں مانگتی اور منتیں مانگتی بیٹھ گئی کہ اللہ میاں مجھے خیریت سے گھر پہنچا دے۔ اتنے نفل پڑھوں گی اور تیرے نام پر اتنے روپے دوں گی۔ اب سفر پھر شروع ہو گیا۔ جاوید تو بسم اللہ کا ورد کرتا گاڑی چلا رہا تھا اور میں **رب یسر ولا تعسر وتمم بالخیر** رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے خیریت سے گھر پہنچا دیا۔

گھر پہنچ کر سیدھی فرج کے پاس گئی۔ فرج کھول کر بوتل کو ہی منہ لگا لیا اور آدھی بوتل ٹھنڈے پانی کی پی گئی پھر بستر پر بے دم لیٹ گئی۔ گھر میں نے کسی کو بھی کچھ نہ بتایا۔ رات جب جاوید نے باورچی خانے کا

کام ختم کرلیا اور وہ مجھے یہ کہنے آیا کہ وہ اپنے کوارٹر میں جا رہا ہے اندر سے دروازہ بند کرلیں تو میں نے اسے ایک ہزار روپیہ دیا۔

''جاوید ابھی تمھاری پریکٹس اتنی نہیں ہے کہ بچوں کو بھیجا جائے یہ ہزار روپیہ لے لو گاڑی میں گیس بھروا لیا کرنا۔ پہلے دو ہفتے تم غلام رسول (صائمہ کا ڈرائیور) کے ساتھ صبح فجر کی نماز پڑھ کر نکل جایا کرو، ناشتے تک مختلف جگہوں پر گاڑی چلاؤ۔ پھر دو ہفتوں کے بعد تم اکیلے گاڑی لے کر جانا اور دور دور تک چلانا۔ ایک مہینے کے بعد میں پھر تمھارا ٹیسٹ لوں گی پھر بچے جائیں گے۔ یہ ہزار ختم ہو گیا تو اور لے لینا۔''

گھر والوں کو کہہ دیا کہ ابھی بچے اس کے ساتھ نہ جائیں جب تک میری تسلی نہیں ہو جاتی۔ رات کوارٹر میں جانے سے پہلے جاوید مجھے روزانہ کی رپورٹ دیتا کہ اس نے لاہور کے کس کس حصے میں گاڑی چلائی ہے۔ مہینے کے بعد ایک دن میں نے غلام رسول کو بلایا اور پوچھا کہ جاوید کیسی گاڑی چلاتا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ ''جی اب بالکل ٹھیک چلاتا ہے۔ کل تو صبح میں اس کے ساتھ پھرتا رہا۔ میں نے تو کہا ہے کہ اب مٹھائی کھلاؤ اور گھر کے بندوں کو تم ہی لاؤ اور لے جاؤ۔'' جاوید پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے اسے پیسے دیے کہ مٹھائی خود بھی کھاؤ، غلام رسول جو تمھارا استاد ہے اسے بھی کھلاؤ اور باہر کے چوکیداروں کا بھی منہ میٹھا کرواؤ۔

میں مصروفیت کی وجہ سے ابھی جاوید کے ساتھ گاڑی میں نہیں بیٹھی تھی۔

ایک دن صبح صبح صائمہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی ہمارے گھر آئی۔ ''امی رات غلام رسول اپنے گاؤں چلا گیا ہے اس کا کوئی قریبی رشتے دار فوت ہو گیا ہے۔ مومنہ کا سکول سات بج کر دس منٹ پر لگ جاتا ہے مومنہ اور نور (میری پوتی) جاوید کے ساتھ چلی جائیں۔''

اور وہ واپس چلی گئی، میں نے سوچا ابھی تک جاوید بچوں کو لے کر سکول نہیں گیا تھا۔ نور اور مومنہ دونوں کریسنٹ ماڈل سکول میں پڑھتی تھیں۔ چلو میں ساتھ ہی بیٹھ جاؤں گی اور اُنھیں چھوڑ آؤں گی۔ باورچی خانے میں گئی۔ ''جاوید تم جلدی سے ناشتہ کرلو مومنہ اور نور کو سکول تم نے چھوڑنا ہے میں ساتھ جاؤں گی۔''

میں بات ہی کر رہی تھی کہ مومنہ یونیفارم پہنے

سکول کا بیگ اٹھائے آ گئی۔ ''نانی اماں نور تیار ہوگئی ہے؟''

''ہاں ہوگئی ہے تم بیٹھ جاؤ جاوید ناشتہ کرلے۔''

ہم دونوں لاؤنج میں بیٹھ گئیں۔نور بھی تیار ہوکر آ کر بیٹھ گئی۔ ''نانی اماں سات دس پر سکول گیٹ بند ہو جاتا ہے پھر جو بھی اندر آئے اس کو جرمانہ بھی دینا پڑتا ہےاور ڈانٹ بھی کھانی پڑتی ہے۔''

اس نے ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔ لاؤنج کی گھڑی پر سات بجنے میں پانچ منٹ تھے۔سکول قریب ہی تھا پانچ چھ منٹ کی ڈرائیو تھی۔ ''بس جاوید ناشتہ ختم کر رہا ہے۔''

میں باورچی خانے میں گئی جاوید وہاں نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے برقعہ پہنا اور پرس پکڑا۔ ''دیکھو جاوید گاڑی میں تو نہیں بیٹھا ہوا؟''

میں نے مومنہ سے کہا۔ وہ بھاگ کر پورچ میں گئی پھر ہانپتی واپس آئی۔ ''نہیں نانی اماں وہاں نہیں۔ ہائے اللہ آٹھ منٹ رہ گئے گیٹ بند ہونے میں۔'' وہ پریشان ہورہی تھی۔

''کوئی بات نہیں پانچ منٹ میں ہم ان شاء اللہ سکول پہنچ جائیں گے۔''میں نے تسلی دی۔

وہ بے چین کبھی اٹھے کبھی بیٹھے کبھی گھڑی دیکھے۔ ''نانی اماں یہ جاوید بھائی کہاں ہیں اب تو چھ منٹ رہ گئے ہیں۔''

وہ رونے والی تھی۔ میں خود پریشان تھی۔ کوارٹروں میں بیل لگوائی ہوئی تھی جس کا پوائنٹ لاؤنج میں تھا میں نے دو مرتبہ زور زور سے بجائی، جاوید پھر بھی نہ آیا۔ ''ہائے اللہ میں کیا کروں آج ہماری بیڈمنٹن کی ٹیم کی سلیکشن بھی تھی ہائے میں رہ جاؤں گی۔''

اس نے رونا شروع کر دیا۔ ''یا اللہ یہ جاوید کہاں ہے کوارٹر میں بیل بھی کی ہے۔''

میں خود بے حد پریشان تھی کیا اُسے میری بات کی سمجھ نہیں آئی کہ اس نے بچوں کو لے کر جانا ہے۔ ''نانی اماں اب میں سکول نہیں جاؤں گی۔ گیٹ بند ہونے میں صرف دو منٹ ہیں۔ ہم کیسے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔'' مومنہ نے روتے ہوئے کہا۔

''مومنہ یہ گھڑی پانچ منٹ پیچھے ہے یہ سات بج کر آٹھ منٹ نہیں ہیں، یہ سات بج کر تیرہ منٹ ہو چکے ہیں اور ابھی ہم گھر ہی ہیں۔''

نور نے پتے کی وہ بات مومنہ کو بتائی جس کا اسے پتا نہیں تھا۔ اس کی چیخیں اور بھی بلند ہوگئیں اور وہ روتی

روتی گھر چلی گئی۔

''دادی اماں اب میں بھی یونیفارم اتار دیتی ہوں۔'' نور نے کہا اور اپنے بیڈروم کی طرف چلی گئی۔

میں حیران پریشان لاؤنج میں کھڑی تھی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور جاوید اندر آیا۔ استری شدہ کپڑے، چمکدار پالش کیے بوٹ، تیل لگا کر اچھی طرح سیٹ کیے ہوئے بال۔ ''جاوید اب تم کپڑے بدل لو مومنہ تو روتی ہوئی گھر چلی گئی ہے اور نور نے بھی یونیفارم اتار دیا ہے۔ دونوں کو سکول سے دیر ہو گئی تھی۔''

میں دل میں جاوید سے بہت ناراض تھی۔ ''جاوید تمھارے کپڑے اچھے بھلے تھے تم بدلنے کیوں چلے گئے اور انھیں دیر کروادی؟''

میں نے ناراضگی سے پوچھا۔

''جی مجھے خیال آیا بچوں کی سہیلیاں یہ نہ کہیں کہ اُن کا ڈرائیور اچھے کپڑوں میں نہیں ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ بعض دفعہ کوئی جاننے والا بھی وہاں مل سکتا ہے۔'' اس نے آہستہ سے اپنی رام کہانی سنادی۔

جلد ہی مجھے یہ پتا چل گیا کہ بجلی یا گیس کا بل جمع کرانا ہو، بنک سے پیسے لینے ہوں، ATM سے پیسے نکلوانے ہوں، بچوں نے سکول جانا ہو، کسی درس یا رشتے دار کے گھر جانا ہو پندرہ منٹ پہلے جاوید کو بتانا پڑے گا تاکہ وہ اپنے حساب سے سج بن کر تیار ہو جائے اور تمام کام وقت پر ہو سکیں۔

☆......☆......☆

محترمہ سمیہ مسعود سے ایک ملاقات

سمیہ مسعود عبدہٗ کا نام بتول کے قارئین کے لیے اجنبی نہیں ۔ ام عبدمنیب کے نام سے بھی لکھتی ہیں سمیہ مسعود شاعرہ، مصنفہ اور عالمہ ہیں ۔اگر یہ کہا جائے کہ ماں کی گود سے اترتے ہی قلم تھام لیا تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ داؤد پور کی فضا نے انہیں شعور عطا کر دیا تھا۔تخلیقی قوت، ذہانت خداداد صلاحیت اور محنت شب و روز کو ملا دیا جائے تو سمیہ مسعود بنتی ہیں۔ کئی کتب کی مصنفہ ہیں۔ دینی مسائل پر ۲۰۰ سے زائد کتابچے شائع ہو چکے ہیں۔ معروف فلم رائٹر مسعود مشہدی کی اہلیہ ہیں جو ایک عرصہ تک فلم لائن سے وابستہ رہے جب دین کے راستے پر چلے تو ایک نئی زندگی ان کی منتظر تھی۔ہم خیال شریکِ سفر ملنے کے بعد دونوں کی زندگی کیسے گزری۔ یہ جاننے کیلئے آیئے سمیہ سے ملتے ہیں۔

میں اور گل رعنا مسعود جب محترمہ سمیہ مسعود کے گھر پہنچے تو وہ اور اُن کی بہو بیٹیاں بڑے تپاک سے گلے لگا کر ملیں۔ان کے گھر میں ریسپشن کے بعد ایک بہت بڑا ہال نما کمرہ تھا جس کے چہار جانب کتابوں کی الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ گھر کیا تھا کتب خانہ تھا، جہاں انہوں نے بہت محبت سے ہمیں لاکر بٹھایا۔ سادہ سی چارپائی پر خود بیٹھیں، ہمارے لیے آرام دہ کرسیاں موجود تھیں۔ بتانے لگیں یہی میرا بیڈ رام ہے ،یہی لاؤنج ہے ،یہی بچوں کے کھیلنے کا کمرہ ہے۔ دو بیٹے شادی شدہ ہیں،ایک اوپر کی منزل پر رہتا ہے، دوسرے کیلئے علیحدہ سے گھر بنوایا ہے جو ہمارے گھر سے متصل ہے، یوں دونوں بیٹے پاس بھی ہیں اور علیحدہ بھی۔ کھانا ہم سب ساتھ کھاتے ہیں۔ مجھے کچھ بھی پکانا نہیں پڑتا بس لکھنے لکھانے کا کام کرتی ہوں۔ چائے اور پھل کی تواضع کے بعد ہم نے بات چیت کا سلسلہ شروع کیا۔

س۔ اپنی تاریخ پیدائش اور خاندانی پس منظر بتائیں گی؟

ج۔ میری تاریخ پیدائش 13اپریل 1955ء یا غالباً1957ء ہے۔ہم لوگ ضلع گجرات کے شہر جلال پور جٹاں کے گاؤں داؤد پور کے رہنے والے ہیں۔میرے دادا میاں حامد علی اپنے گاؤں کے قدیم دور کی مسجد کے متولی عہدیدار اور سیاسی معاملات کے نگران تھے، ایک طرح کے گاؤں کے چودھری تھے نیز حکمت ان کا پیشہ تھا۔ دینی رعب و دبدبہ بھی ان کے پاس تھا۔ بریلوی عقیدہ رکھتے تھے۔ان کی ایک بیٹی اور

چار بیٹے تھے۔ بیٹی بڑی تھیں۔ میرے والد حکیم غلام حیدر طور سب سے چھوٹے تھے۔ والد صاحب اپنے گاؤں کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے شخص تھے انہوں نے ادیب عالم اور منشی فاضل کے امتحان پاس کیے ہوئے تھے اور جلال پور جٹاں کے مشہور گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول میں استاد تھے،نویں دسویں جماعت کو پڑھاتے ،وہیں سے ریٹائر ہوئے۔سکول کے ہفتہ وار اور سالانہ پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔کیونکہ ادبی ذوق رکھتے تھے۔اردو پنجابی کی نظمیں کہتے اور مزاحیہ ادب بھی لکھتے۔

س۔آپ کی تربیت اور مزاج میں والد صاحب کا زیادہ اثر ہے یا والدہ کا؟

ج۔ہم سب بہن بھائیوں کی تربیت اور مزاج میں ہمیشہ والد صاحب کا اثر غالب رہا۔بات چیت معاملات میں ہم سب انہی پر ہیں البتہ مزاج کا عنصر کم کم ہے۔ والد صاحب کے مزاج میں صبر و تحمل کمال درجے کا تھا۔ایک بار سڑک پر جا رہے تھے تانگے کا پورا پہیہ اوپر سے گزر گیا لوگ کہتے ہیں نہ انہوں نے ہائے کی نہ اف کی بلکہ اٹھے اور خاموشی سے چل دیئے حتیٰ کہ تانگے والے کو بھی کچھ نہ کہا یہ تو تھا ان کا صبر اور تحمل البتہ یہ تھا کہ میری والدہ مزاج کی تیز خاتون تھیں اور جلد گھبرا جاتی تھیں،اور بہت زیادہ بولتی تھیں اکثر والد صاحب کو ڈانٹ پڑ جاتی اور وہ خاموشی سے سن لیتے کبھی کچھ نہ کہتے۔والدہ رسم و رواج کی دلدادہ تھیں مگر فہم و فراست اور نفاست پسندی میں بہت سوں سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ہم لوگ ابا جی سے بے تکلف تھے مگر والدہ سے ڈرتے تھے۔کوئی بھی ایسا واقعہ مجھے یاد نہیں کہ میری والدہ نے مجھے گود میں بٹھا کر پیار کیا ہو جبکہ والد صاحب مجھے گود میں بٹھا کر کھلاتے پلاتے۔میری والدہ انکی دوسری بیوی تھیں جبکہ پہلی بیوی سے تین بچے تھے اور میری والدہ سے تیرہ بچے ہوئے جن میں سے چار باقی ہیں باقی وفات پا گئے۔ڈاکٹر افتخار الحق کے بعد میں ہوں۔

س۔اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں بتائیں نیز پڑھنے لکھنے کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

ج۔میرے بہن بھائیوں میں صرف مجھے ادبی ذوق تھا۔ میں ابا جی کی عربی، اردو اور فارسی کی کتابیں پڑھا کرتی تھی۔اس دور میں لڑکیوں کو سکول بھیجنے کا رواج نہیں تھا۔پندرہ دیہات کا صرف ایک ہی سکول تھا۔جہاں لڑکے لڑکیاں سبھی پڑھتے تھے۔ہم

سب بہن بھائیوں نے پانچویں جماعت تک وہیں پر پڑھا ہے۔ میٹرک کیلئے جلال پور جٹاں جانا پڑتا تھا۔ میں آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ مگر مجھ میں اتنی جرات نہ تھی کہ کہہ سکوں کہ مجھے آگے پڑھنا ہے۔ ہمارے گھر کی تربیت ہی ایسی تھی کہ کسی بھی خواہش کا کبھی اظہار نہ کیا تھا۔ نہ کبھی کہا کہ ایسے کپڑے بنانے ہیں، فلاں چیز چاہیے یا فلاں سے ملنا ہے یا کسی رشتہ دار کے گھر جانا ہے ہر چیز کا خود ہی سے احساس تھا کہ ایسی خواہشات بے معنی ہیں۔ ابا جی خود سے چاہتے تھے کہ مجھے پڑھنا چاہیے۔ ایک سکول ٹیچر کی بیٹی میری سہیلی تھی وہ ہائی سکول میں پڑھنے جاتی تھی۔ اس نے مجھ سے کئی بار کہا کہ تم بھی چلو مگر میں ابا جی سے نہ کہہ سکی، ابا جی میرے ادبی شوق کو جانتے تھے، انہوں نے شاہ ولی اللہ کا اردو اور فارسی قرآن کا ترجمہ پڑھ رکھا تھا اس لیے لوگ ان کے پاس اپنے بچوں کو بھیجتے تاکہ قرآن کا ترجمہ پڑھ لیں اور ابا جی اپنے چھوٹے شاگرد لڑکوں کو میرے پاس پڑھنے کے لیے بھیج دیتے کئی لڑکیاں جو مجھ سے پڑھنے آتیں وہ عمر میں مجھ سے کافی بڑی ہوتیں۔ مجھے انہیں پڑھانے کے لیے کافی محنت کرنا پڑتی میں انہیں سکول کا سبق بھی پڑھاتی اور قرآن کا ترجمہ بھی یوں ان کے ساتھ ساتھ میرا اپنا شوق بھی پورا ہوتا گیا۔ ہمارے گھر میں صرف دو کتب تھیں ایک بہشتی زیور اور احمد علی شیرانوالے کے رسالے تھے جو میں ان بچیوں کو پڑھاتی۔

ان لڑکیوں سے میں کہتی تمہارے گھر میں جو بھی کتاب، رسالہ، اخبار کا کاغذ کچھ بھی ہو وہ لے آیا کرو چاہے وہ کٹی پھٹی کیوں نہ ہو۔ اس طرح میں نے بھگوت گیتا، سیف الملوک، ہیر وارث شاہ، احوال الآخریہ، مفتی احمد یار کی جاء الحق پڑھ ڈالیں، گاؤں کی ایک لڑکی کے گھر سے ناول ملا ''صاحبزادی'' جس میں کوئی اصلاحی بات نہ تھی اسے پڑھ کر مجھے لگا میں نے بہت غلط کام کیا ہے اور اس طرح کی کتابیں اچھی نہیں ہوتیں۔

س۔ گھر کے کاموں سے بھی کوئی دلچسپی تھی یا صرف لکھتی پڑھتی رہیں؟

ج۔ میرا شروع سے مزاج لکھنے پڑھنے والا تھا۔ سہیلیاں کوئی نہ تھیں۔ کھلے کمرے میں ہم سب بہن بھائی چارپائیوں پر ہوتے۔ ماں جی چرخہ کاتتیں اور ہم سب اپنے بستروں پر بیٹھ کر کورس کی کتابیں پڑھتے رہتے۔ میں نے کروشیہ بننا بھی سیکھا، چرخے پر سوت

بھی کاتا،سلائی کڑھائی کے سبھی کام کیے مگر پڑھائی سب پر غالب رہی روزانہ سوڈیڑھ سو صفحے پڑھ کر سوتی۔

بچوں کے رسالے نور، کھلونا، پھلواری، خواتین کے رسالے، اخبار جہاں وغیرہ بھی پڑھے، نور اس وقت کئی رنگوں میں چھپا کرتا تھا۔ پہلی کتاب جو میں نے باقاعدہ ہوش میں آنے کے بعد پڑھی وہ مولانا مودودی صاحب کی ''پردہ'' تھی۔ یوں میرا مولانا سے پہلا تعارف اس کتاب کے ذریعے ہوا۔ اباجی نے کہا جماعت اسلامی کو ووٹ دینے ہیں ہمارے ہاں کی خواتین ووٹ ڈالنے نہیں جایا کرتی تھیں۔

س۔شاعری کا شوق کیسے ہوا، پہلا شعر کون سا کہا؟

ج۔ مجھے نعتیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔''ضیائے حرم'' پیر کرم شاہ الازھری کے رسالے میں چھپی نعتیں باقاعدگی سے پڑھتی۔ اس طرح شاعری کرنے لگی اور ساتھ ہی نعت کہنے لگی۔ ایک روز میں نے بھائی افتخار کو بتایا کہ میں نعت لکھ رہی ہوں تو انہوں نے مجھے کہا میں بھی ایک نعت لکھ رہا ہوں ''شعور نور حضور'' یوں پہلے ہم دونوں لڑا کرتے تھے اب ہمارا ساتھ ہو گیا۔ وہ مجھے شعر سناتے اور میں انہیں۔ ہم لوگ مظفر وارثی، ادا جعفری، احمد ندیم قاسمی کے کلام ریڈیو پر سنتے۔ علیم ناصری، خالد بزمی، نعیم صدیقی کے مشاعرے اور نعتیہ کلام بھی شوق سے سنتے۔ میرے بھائی کا قافیہ ردیف مجھ سے بہتر تھا۔۱۹۷۲ء میں عبدالعزیز خالد کی نعت آئی جو بہت مشہور ہوئی۔

؎ میں فرش زمیں ہوں تو سقف سماء

ہے

یہ نعت ڈیڑھ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ میرے بھائی نے اسی قافیہ ردیف میں لکھی اور میں نے بھی لکھی ۱۷۰ اشعار میرے ہیں۔

س۔اپنی شادی کے بارے میں کچھ بتائیں۔

ج۔ میرے میاں مسعود مشہدی میری پھوپھی کے بیٹے ہیں۔ میری اور ان کی عمر میں تفاوت ہے۔

س۔آپ کی اور آپ کے میاں کی عمر میں فرق کی کیا وجہ تھی؟

ج۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔

س۔اگر آپ سنانا پسند کریں تو ہمیں خوشی ہوگی۔

ج۔ جی ضرور (مسکراتے ہوئے) جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میرے میاں میری پھوپھو کے بیٹے ہیں۔ میرے میاں کی پیدائش پر پھوپھی ایک بیٹی

اور ایک بیٹا چھوڑ کر فوت ہوگئیں۔ یوں دونوں بہن بھائی نے سوتیلی والدہ کے زیر سایہ پرورش پائی۔ان کے والداور والدہ دونوں کے مزاج میں بے حد سختی تھی۔ انکی سخت مزاجی کے سبب میرے میاں گھر سے باغی ہوتے چلے گئے اور اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنے لگے۔یتیم ہونے کے سبب دونوں بہن بھائی بے حد حساس تھے۔ میرے میاں اکثر گھر سے فرار ہوئے رہتے۔ چودہ برس کی عمر کو پہنچنے پر وہ زندگی کے بہت سے تلخ پہلوؤں سے آشنا ہو چکے تھے۔مسعود مشہدی بتاتے ہیں''میں سات برس کا تھا گھر پہنچنے میں دیر ہوگئی والدصاحب کے خوف سے گھر نہ گیا۔رات کو مسجد یں بھی بند ہوجاتی تھیں،پارک بھی بند تھے، مجھے دور بھینسوں کی کھرلی دکھائی دی میں وہیں زمین پر دعائیں پڑھتا پڑھتا سوگیا اچانک میری نیند کھلی تو کیا دیکھا ایک خوفناک کتا پاس کھڑا مجھے سونگھ رہا ہے مجھے لگا ابھی یہ مجھے چیڑ پھاڑ کر کھا جائے گا مگر میرے رب نے مجھے بچالیا۔''

ایک اور واقعہ سناتے ہیں''میں ننھیال جارہا تھا راستے میں مجھے ایک مرد ملا اس نے پوچھا تم کہاں جارہے ہو،میں نے بتایا تو وہ مجھے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے کر جموں کشمیر چلا گیا۔تمام راستے مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا۔ مجھے کہا میری کوئی اولا دنہیں ہے تم میرے بیٹے بن کر میرے پاس رہنا۔گھر پہنچ کر بیوی سے کہا اسے کھانا دو کھانے کے بعد مجھے ایک کمرے میں سلا دیا مگر مجھے نیند نہیں آرہی تھی آدھی رات کو میں نے دیکھا ایک بوڑھی عورت اس آدمی سے کہہ رہی تھی یہ بھی کسی کا بچہ ہے تم ایسا نہ کرو۔ وہ مرد بولا اسے ذبح کر کے اس کے خون سے اپنی بیوی کو نہلاؤں گا تو تب میرے ہاں بچہ پیدا ہوگا۔ میں اسی لیے اس کو یہاں لایا ہوں تم مجھے منع نہ کرو۔ میں نے جب ان کی باتیں سنیں تو میں ڈر گیا۔ دو گھنٹے میں خوف کی کیفیت میں مبتلا اسی طرح بستر پر پڑا رہا، اسی اثناء میں اس عورت نے دروازہ کھولا اور مجھے کہا جتنی جلدی اور جتنی دور یہاں سے بھاگ سکتے ہو بھاگ جاؤ۔

رات کا وقت تھا جنگل بیاباں میں سرپٹ بھاگ رہا تھا کہ ایک آدمی گدھے پر سوار ملا اس نے میری مدد کی اور سمجھایا آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا اس نے مجھے میرے رشتے کے نانا کے گھر پہنچایا یوں میں نے شکرادا کیا۔زندگی جوں توں گزر رہی تھی۔ زندگی کی بقاء کا مسئلہ تھا۱۹۴۶ء میں میں نے اورنٹیل کالج سے منشی

فاضل کیا۔ محمد شفیع، آقا بیدار بخت،اصغر علی روحی، شاداں بلگرامی میرے اساتذہ میں سے تھے۔ آقا بیدار بخت نے دہلی دروازہ کے باہر شاہ محمد غوث کی مسجد ومزار کے پیچھے میونسپلٹی کے کوارٹرز میں ''السنہ شرقیہ'' کے نام سے کالج کھول رکھا تھا۔اس کالج میں اردو کے تین امتحانات ادیب، ادیب عالم اور ادیب فاضل کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کی تین کلاسز منشی، منشی عالم اورمنشی فاضل کی تیاری کروائی جاتی تھی۔ کلاسز شام ۴ بجے سے رات ۱۰ بجے تک جاری رہتیں۔ان میں اکثر غریب طلباء یاملازم پیشہ نوجوان ہوتے۔مشرقی علوم کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد انگریزی کا امتحان دینے سے انہیں میٹرک ،ایف اے اور بی اے کی ڈگری مل جاتی جس سے وہ انگریز سرکار کے کسی بھی دفتر میں نوکری حاصل کر سکتے تھے، بتاتے ہیں:

''خستہ حال اوردودن کے بھوکے نے جب آقابیدار بخت کے سامنے اپنی درخواست رکھی اورانہیں بتایا کہ میں غزلیات نظیری پڑھا سکتا ہوں موقع دیجیے،انہوں نے میری کم عمری دیکھی سفارشی رقعہ دیکھا جو پروفیسر سید عبداللہ اور شاداں بلگرامی نے لکھا تھا توانہوں نے مجھ سے نظیری کے ایک شعر کا مطلب پوچھا۔

نظیری گر طمع داری کہ مقبول نہاں باشی
ولا تحسد، ولاتبخل ولا تحرص علی الدنیا

ترجمہ:نظیری اگرتم میخانہ کے کرتا دھرتا کی نظروں میں محبوب بننا چاہتے ہوتواپنی زندگی کی عمارت تین اصولوں پرقائم کرو۔

۱۔کسی سے حسد نہ کرو۔

۲۔اگرکچھ پاس ہےتوکسی دوسرے کودینے میں بخل نہ کرو۔

۳۔اوردنیا کوحاصل کرنے کےلالچ میں نہ پڑو۔

اسی طرح دوتین شعروں کا ترجمہ وتشریح سننے کے بعد مطمئن ہوگئے اوریوں مجھےان کے ہاں ملازمت مل گئی۔

اس کالج میں حلقہ ارباب ذوق کی ادبی نشست بھی ہوا کرتی تھی، مجھے بھی لکھنے کا شوق تھا انہی دنوں اطلاع ملی کہ ممبئی کے ایک افسانہ نگار رومانندت گرجو اس وقت کے ممتاز ہیروراج کپور کے سٹوری رائٹر ہیں وہاں آرہے ہیں۔میرے خیالوں میں فلمی دنیا کے تصورات ابھرنے لگے۔

محلے کے تین لڑکے ممبئی فلموں میں کام کرنے کے

شوقین جن میں ایک میں تھا۔ ہم نے پیسے جمع کیے اورممبئ چل پڑے ایک لڑکا جس کے پاس پیسے جمع کرائے تھے وہ خاموشی سے پیسے لے کر رفو چکر ہوگیا،اورہم دورہ گئے۔

ان دنوں پنجاب یونیورسٹی بن رہی تھی، احسان دانش وہاں مالی تھےاورمزدوروں کے ساتھ کام کر کے انہوں نے یہ عمارت تعمیر کی اور بعد میں اسی یونیورسٹی سےانہیں اعزازی ڈگری دی گئی۔

حلقہ ارباب ذوق کے ایک مشاعرے میں میری راجندرسنگھ بیدی،میرا جی، ن م راشد، قیوم نظر، ساحر لدھیانوی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے احسان دانش کو پہلی بار وہاں وہ غزل سناتے ہوئے سنا جس کی وجہ سے انہیں شہرت ملی۔ تمام شعراءان سے تمام رات ایک ہی شعر سنتے رہے اور داد دیتے رہے۔ میں نے مآل گل کے نام سے مضمون پڑھا

انہی دنوں تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ شیرانوالہ گیٹ میں مجلس احرار کا جلسہ تھا۔آغا شورش کاشمیری، عطاء اللہ شاہ بخاری، مجید نظامی، چودھری افضل حق شامل تھے۔ میں انتظامیہ میں تھا، مائیک سیٹ کرنے کے دوران میں نے زوردار تقریر کی۔ جلسے کے اختتام پر سبھی معززین کوگرفتار کرلیا گیا جس میں میں بھی شامل تھا۔ چھ ماہ جیل میں رہا۔

جیل سے رہائی کے بعد والد صاحب نے مجھے گھر میں نظر بند کر دیا حتیٰ کہ کھانا بھی بند کر دیا۔میری بڑی آپا رات کومیرے پاس چھت پرآئیں ،انہوں نے مجھے تین پیسے دیئے اور کہا کہ فوراًیہاں سے چلے جاؤ اورآئندہ یہاں کبھی واپس نہ آنا۔

یوں میں ممبئ پہنچ گیا،ایک روزممبئ کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے ایک عالم سے ملاقات ہوگئی۔ وہ مجھے اپنے مکتبے لے گئے،ا نکے مکتبے کا نام ''اشرف الاد اۃ'' تھا یہ دیوبندیوں کا مکتبہ تھا۔ ان کے گھر سے کھانا بھی ملتا۔ میں تمام دن پارکوں میں گھومتا پھرتا اوررات کوان کے ہاں آ کرسو رہتا۔ ایک روز پارک میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اسے بتایا میں کام کی تلاش میں ہوں پڑھا لکھا ہوں انگریزی،عربی، فارسی اوراردو پر عبور حاصل ہے۔اس نے کہا میں فلم ڈائریکٹر ہوں میں تمہیں ایک سین بتا تا ہوں اس کے مکالمے لکھ دواگر کامیاب ہوگئےتوتمہیں کام مل جائے گا۔ سین کچھ یوں تھا۔ بڑا بھائی بستر مرگ پر چھوٹا بھائی اس کے لیے دعا مانگ رہا ہے۔

مجھے مناجات بہت اچھی آتی تھی ساری عمر دعائیں ہی تو کی تھیں میں نے ڈائیلاگ لکھ دیا۔ اس نے کہا آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ اس نے مجھے اگلے روز اپنے دفتر میں بلا لیا۔ وہ ہندوستان کا مایہ ناز ڈائریکٹر محبوب تھا۔ اس نے کہا آپ کو کام مل گیا ہے یہ آپ کا دفتر ہے، میز ہے کرسی ہے، کاغذ حاضر ہے۔ آپ نے میری فلم کے مکالمے لکھنے ہیں۔ یوں میں نے مکالمے لکھے اور جس کے عوض مجھے پانچ سو روپے ملے جو بہت خطیر رقم تھی۔ یوں میں نے بطور کہانی نویس بہت سی فلموں کے مکالمے اور کہانیاں لکھیں جن میں چند کے نام ہیں ''دوبدن، کاغذ کے پھول، رستم سہراب، انسپکٹر، ہماراجج'' آخری فلم تھی۔

انہی دنوں معروف اداکار دلیپ کمار سے کافی دوستی ہوگئی۔ میری شکل دلیپ کمار سے بہت ملتی تھی۔ اس کے گھر میرا بہت آنا جانا تھا۔ اس کی بہن زبیدہ نعتیہ شاعری کیا کرتی تھی جو اکثر مجھے سناتی۔ انہی دنوں دلیپ کمار سے میرا فلم بنانے پر معاہدہ ہوا کہ وہ پیسہ لگائے گا اور میں کہانی لکھوں گا۔ یوں میرا اس کے گھر آنا جانا زیادہ ہوگیا۔ ایک روز میں اس کے گھر گیا تو کیا دیکھا کہ اس کی میز پر شراب کی بوتل پڑی ہے اس سے پہلے میرے علم میں نہ تھا کہ وہ شراب پیتا ہے، میں غصے میں آ گیا میں نے کہا رسولؐ نے فرمایا ہے جس دسترخوان پر شراب رکھی ہو اس پر بیٹھنا جائز نہیں۔ یوں میں اسے چھوڑ آیا۔

عصمت چغتائی کے میاں شاہد احمد دھلوی سے کافی دوستی رہی۔ ان کے ساتھ اکٹھے چائے پینی ہوتی۔ شاہد اکثر کہتا۔ آپ کی بھابھی سے میری لڑائی ہے۔ عصمت اکثر اسے مارتی ڈانٹتی بدزبانی کرتی اور گھر سے باہر نکال دیتی۔ وہ مجھے کہتا جب تم ساتھ ہوتے ہو تو وہ مجھے کچھ نہیں کہتی۔ آپ کے آنے سے مجھے رعایت مل جاتی ہے۔

ان دنوں لڑکے لڑکیاں میرے دفتر میں آتے کہ انہیں فلم میں کام دلوا دیں چاہے بیرے کی نوکری ہی کیوں نہ ہو۔ ایک روز مولانا ابوالکلام آزاد کی نواسی میرے دفتر میں آئی کہ مجھے فلم لائن میں کام دلوا دیں اسے میں نے سمجھا بجھا کر واپس بھیجا کہ آپ کے لیے یہ لائن ٹھیک نہیں ہے۔

انور شاہ کشمیری دیوبند مدرسے کے بہت بڑے عالم شیخ الحدیث تھے ان کے تین بیٹے اسرار، انوار، ارشد فلم میں کام کرنا چاہتے تھے۔ میرے پاس آئے میں نے

انہیں سمجھایا میں تو پھنس گیا ہوں۔آپ باعزت گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں آپ یہ راستہ اختیار نہ کریں۔

یہ غالباً۱۹۶۸ء کی بات ہے۔مدینہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔انہوں نے داخلے بھیجے اوران کے داخلے ہوگئے اوروہ فلم لائن بھول کرادھر چلے گئے۔کچھ روز وہ میرے پاس رہے ،میں ان کے لئے کھانا بناتا کپڑے دھوتا،ان کے کپڑے استری کرتا اس طرح میری ان سے دوستی ہوگئی۔میں نے علم وحکمت کے نام سے شمارہ نکالا۔ابھی ایک ہی پرچہ نکلا تھا کہ وہ سعودیہ چلے گئے ۔انہی دنوں دلیپ کمار کی بہن زبیدہ میرے لیے رشتے دیکھتی رہی کہ جیسا آپ کا علمی مزاج ہے ویسی لڑکی ڈھونڈ رہی ہوں۔ میں نے منع کر دیا اور کہا میں شادی وطن جا کر کروں گا۔

فلمساز محبوب نے پاکستان جانے کا ارادہ کرلیا توانہی دنوں مجھے ٹائیفائیڈ ہوگیا۔کوئی میرے پاس نہیں تھا نہ کوئی بہن نہ بھائی ایک عمر رسیدہ صاحب جو بذات خود شریف آدمی تھے۔ مجھے اپنے گھر لے گئے، میں ان کے گھران کے فرد کی طرح رہا۔انہوں نے میرا بہت خیال رکھا۔تب مجھے احساس ہوا کہ خاندان کتنا ضروری ہوتا ہے۔۱۹۷۰ءمیں میں نے حج پر جانے کا ارادہ کیا۔ بیت اللہ شریف کے قریب ہی مدرسہ صولتیہ ہے جس کی بنیاد ڈیڑھ سو سال قبل رکھی گئی تھی۔میں ان لوگوں سے جا کر ملا۔انور ارشد نے مدرسہ والوں کو پیغام بھیجا کہ مسعود مشہدی ہمارے بہت قریبی ساتھی ہیں،آپ انہیں اپنے پاس ٹھہرائیں۔یوں انہوں نے مجھے اساتذہ کے کمرے میں ٹھہرایا۔میں نے کچھ عرصہ مدرسے میں پڑھایا۔ مدرسے والوں نے کہا آپ اگر کہیں تو ہم آپ کے گھر والوں کا پتا لگواتے ہیں میں نے اجازت دے دی۔

گھر والوں کا پتا معلوم کرلیا گیا ماں باپ وفات پا چکے تھے۔میری آپا جی میرے بارے میں جان کر بے چین ہوگئیں۔انہوں نے کہا کیا مسعود کا عقیدہ ٹھیک ہے اگر ٹھیک ہے ہم اسے ضرور ملیں گے۔انہوں نے مدرسہ صولتیہ والوں کو خط لکھا انہوں نے کہا عقیدہ ٹھیک ہے۔یوں خط وکتابت شروع ہوگئی۔۱۹۷۶ ء میں آپا جی حج کے لئے آئیں۔چاہ زمزم پر ہم دونوں بہن بھائیوں کی ملاقات ہوئی۔برسوں بعد ملے تھے۔لوگ ہمیں دیکھنے وہاں جمع ہوگئے اور پھر میں نے پاکستان آنے کا ارادہ کرلیا۔‘‘

س۔آپ کی ان سے شادی کی بات کیسے چلی؟

ج۔پاکستان آنے کے بعد ایک روز وہ ہم سب سے ملنے ہمارے گھر آئے،ان کی آمد میری زندگی کا یادگار دن ہے۔کسی ایسے شخص کو دیکھنا جس کے بارے میں صرف باتیں ہی سنی ہوں۔زندگی کا دلچسپ تجربہ ہوتا ہے انہیں دیکھنے کے لیے پورے گاؤں سے لوگ اُمڈ آئے تھے۔میرے اباجی کی دوسری شادی سے پہلے ہی وہ دیارِغیر جا چکے تھے ہم سب بہن بھائیوں اورمیری امی سے ان کی پہلی ملاقات تھی۔انہوں نے ہم سے سورۃ فاتحہ کی تفسیر سنی۔میری شاعری دیکھی، افتخار بھائی کی شاعری دیکھی۔انہیں اوراباجی کو بھی اسی دن معلوم ہوا کہ میں لکھتی بھی ہوں یہ سب جان کر بہت خوش ہوئے۔اسی رات گھر کے بڑوں نے آپس میں فیصلہ کرلیا کہ میری شادی مسعود مشہدی کے ساتھ کردی جائے۔اباجی کو معلوم تھا کہ میرے خاندان میں ایسا کوئی نہیں ہے جو میرے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔خاندان کی کچھ خواتین نے انہیں منع کیا کہ وہ یہ رشتہ نہ کریں۔ان کا کہنا تھالڑکی کچھ بیمار رہتی ہے ہوشیار نہیں ہے۔شہری ماحول کی عادی نہیں ہے۔اسے انگلش بولنی پڑھنی نہیں آتی۔آپ اونچی سوسائٹی سے آئے ہیں۔آپ کا ان سے نباہ مشکل ہے۔مگر وہ فیصلہ کر چکے تھے۔تقریباً تین چار ماہ بعد ان سے میری شادی ہوگئی۔شادی کے وقت میری عمر صرف انیس سال تھی اوران کی عمر ترپین برس تھی۔مارچ ۱۹۷۷ءکو ہماری شادی ہوگئی۔

س۔شادی کے کوئی واقعات بتائیں؟

ج۔سادگی سے شادی ہوئی۔میرے بھائی انعام اورمیری شادی اکٹھی ہوئی جس روز انعام کا ولیمہ تھا اس روز میری رخصتی ہوئی۔بیس پچیس لوگ بارات کے ساتھ آئے۔اس وقت سمجھتی تھی حضرت فاطمہؓ کو جو چیزیں شادی کے موقع پر ملیں مجھے بھی وہی لینی چاہئیں۔میں نے اسی کے مطابق چیزیں لیں۔بری میں پانچ جوڑے آئے جو سبھی نہایت قیمتی تھے۔میاں کا کوئی گھر بار نہ تھا۔یوں ہم نے زندگی صفر سے شروع کی۔وہ جانتے تھے کہ نہ ہی مجھے اوڑھنے کا شوق ہے اور نہ ہی بننے سنورنے کا۔مجھے تو صرف کتابیں چاہیے تھیں۔

س۔ولیمے اور بعد کے حالات بتائیں؟

ج۔شادی کے بعد ہم ان کی بڑی بہن آپا جی نذیراں بیگم جوام اقبال کیلانی کے نام سے معروف تھیں

کے گھر رہے ۔انہوں نے گھر پہنچتے ہی مجھے نماز پڑھوائی۔ان کے جانے کے بعد میں تفہیم القرآن پڑھتی رہی۔ ولیمہ خوش کن تھا۔سبھی علمی وادبی گفتگو کرتے رہے جومیرے لیے پسندیدہ ماحول تھا۔

ثریا بتول علوی تحفے کے طور پر کتابچہ لائیں تب مجھے ان کے لکھنے کے بارے میں معلوم ہوا۔انہی کے توسط سے پہلی بار ماہنامہ بتول سے تعارف ہوا اور نیّر بانو صاحبہ کے نام سے بھی پہلی بار متعارف ہوئی۔

س۔کیا آپ کے میاں کا پاکستان آنے کے بعد بھی فلمی دنیا سے تعلق رہا؟

ج۔فکر معاش کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔کچھ عرصہ فلموں کے لیے لکھتے رہے پھر معروف اداکار محمد علی اوراس کی بیگم زیبا کے ساتھ ملکر ایک فلم جو فلسطین پر بنائی گئی تھی اس کی کہانی لکھی۔ کچھ مکالمے سنسر نے حذف کردیئے ، جس کے بعد یہ دل برداشتہ ہوگئے اورفلم لائن سے منہ موڑ لیا۔

س۔کیا وہ فلم کی کمائی جائز سمجھتے تھے؟

ج۔دین سے تعلق تو روزاول سے جڑا ہوا تھا۔وہ سمجھتے تھے کہ وہ اچھے لکھاری ہیں اورفلم کے ذریعے وہ اصلاح کا کام کرسکتے ہیں اورکسی عالم نے بھی کبھی انہیں نہ ٹوکا کہ آپ کی کمائی حرام ہے۔بعد میں بہن بھائیوں اور ملنے جلنے والوں نے انہیں کہا کہ فلم لائن چھوڑ دیں اور انہوں نے خوب سوچ سمجھ کر ان لوگوں سے مستقل کنارہ کشی اختیا کرلی۔

س۔فلم لائن چھوڑنے کے بعد معاشی سلسلہ کیسے جاری رہا؟

ج۔مختلف جگہوں سے تراجم کا کام ملتا رہا مگر وہ ادائیگی بہت دیر سے کرتے تھے۔سڑکوں پر بورڈ بھی لکھے۔کتابوں کی پروف ریڈنگ کا کام ملتا رہا۔ ٹیوشن سنٹر کھولا،اسٹیشنری کی چھوٹی سی دکان بھی کھولی پراپرٹی ڈیلر کی حیثیت سے بھی بیٹھے۔لیکن جم کر کوئی کام نہ کرسکے۔ اسی دوران نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل سے ملاقات ہوئی انہوں نے ان کا نام سن کر بے حد پذیرائی کی جنرل ضیاء الحق کے دور میں محمد طفیل نے نقوش کے سیرت نمبر نکالے تھے۔ اس کی چار جلدوں کا کام میرے میاں نے کیا۔''طریق الہجرت النبویہ''از عبدالقدوس انصاری سعودی صحافی کی لکھی ہوئی ہےاس کا ترجمہ کیا جو سیرت نمبر میں شامل ہے۔انہوں نے اسی وقت آٹھ سوروپیہ دیا۔اس وقت اسی کی دھائی میں آٹھ سو روپے کی کافی قدروقیمت تھی۔ترجمے کا کام ہم

نے چھ سال تک کیا۔ پروف ریڈنگ میں کرتی تھی اس طرح بے شمار کتب میری نظر سے گزری ہیں۔ اور میرا مطالعہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

س۔کیا گھر کے کاموں میں آپ سے تعاون کرتے تھے؟

ج۔میں کافی صفائی پسند واقع ہوئی تھی۔کپڑے بغیر استری کے کبھی نہ پہنتے تھے مگر انہوں نے مجھے ان تمام کاموں سے منع کر دیا۔کہا بس ضروری صفائی کرلیا کرو کپڑے استری کرنے سے بھی روک دیا۔خود کھانے پینے کے شوقین نہیں تھے البتہ پھل شوق سے گھر لاتے۔کھانے کا معاملہ یہ ہوا کہ مجھے کہا ہنڈیا میں سبزی، گوشت، نمک مرچ پانی سب کچھ ڈال کر چولھے پر رکھ دیں جب سب کچھ گل جائے گا تو جو بھی جیسا بھی سالن تیار ہوگا وہ ہم کھالیں گے۔یوں میں ان کے رنگ میں رنگی گئی۔ان کا کہنا تھا اس طرح جو بھی وقت بچے وہ لکھنے پڑھنے میں لگاؤ۔

س۔بحثیت شوہر کیسے تھے؟

ج۔شخصیت کے لحاظ سے بہت زیادہ خوبیوں کے مالک تھے۔ میرا بہت خیال رکھتے۔ مجھے بھنے ہوئے چنے اور گنے بہت پسند تھے وہ ضرور میرے لیے میری پسند کی چیزیں لے کر آتے۔ بہت ذمہ دار تھے گھر سے جانے سے پہلے ڈبوں میں چیزیں دیکھ کر جاتے کہ کیا سامان گھر میں آنے والا ہے تاکہ واپسی پر لے آئیں۔ بہت زیادہ باتونی تھے شادی کے تین چار سال تک تو میں ان کے قصے کہانیاں ہی سنتی رہی۔میرے پڑھنے کے شوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھے کتابیں لاکر دیتے۔ میں نعتیں اور قوالیاں سننے کی شوقین تھی۔ریڈیو پر نعتیں مشاعرے، ادبی پروگرام سبھی مجھے سنواتے۔عمدہ لباس پہننے کے شوقین تھے خود بھی اچھا لباس پہنتے اور مجھے بھی لاکر دیتے۔ انکی خوش لباسی کا اندازہ آپ اس بات سے لگالیں کہ شادی کے بعد میں نے دیکھا ان کے پاس تئیس سوٹ تھے جن میں پینٹ کوٹ، تھری پیس سوٹ اور دس بارہ رنگا رنگ ٹوپیاں تھیں۔ان کے برعکس میرا مزاج سادہ تھا۔ میرے لیے جو لے آتے میں وہی پہن لیتی، میں نے آج تک بازار سے کبھی کوئی خریداری نہیں کی۔

س۔اپنے بچوں کے بارے میں بتایئے؟

ج۔میرے آٹھ بچے ہیں۔مریم خنساء، عبدمنیب، عبدالذوالاکرام، مدیحۃ الرسول، ام شریک، مستغفر الرحمٰن، محبّ الرحیم، مقنت عبداللہ بن مسعود، جن میں

سے مریم خنساء ایک بچی غفیرہ کو چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہوچکی ہیں اور بیٹا عبدالذوالاکرام، جہاد کشمیر میں شہادت جیسا بلند مرتبہ پاچکا ہے۔ محبّ اور مقنت کے علاوہ باقی بچے شادی شدہ ہیں اور برسرِ روزگار ہیں۔ سبھی کمپیوٹر سے متعلقہ کاموں میں مصروف ہیں۔

س۔ آپ مریم خنساء اور ذوالاکرام کے بارے میں کچھ بتائیں۔

ج۔ مریم فروری ۱۹۷۸ء کو پیدا ہوئی۔ میرے میاں نے شروع سے ہی مجھے اس سے مہمل باتیں کرنے سے منع کیا تھا وہ کہتے بچوں کو مخاطب کر کے سبحان اللہ، الحمدللہ کہنا چاہیے۔ شروع میں مشکل لگا بعد میں عادت بن گئی۔ مریم کی پیدائش کے وقت میرے میاں دوسرے کمرے میں بیٹھے آل عمران کی تلاوت کر رہے تھے۔ میرے پاس نرس تھی۔ جب وہ سورۃ کی اس آیت پر پہنچے وَ لَيْسَ الذَّكَرُ...ترجمہ یہ ہے" لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے اور میں نے اس کو اور اسکی اولاد کو تیری پناہ میں دے دیا شیطان مردود کے فتنے سے بچنے کیلئے۔"(۳۶)

اسی وقت مریم کی ولادت ہوئی میرے میاں کو یقین ہوگیا کہ وہ اس کا نام مریم رکھیں گے۔ جب ہماری شادی ہوئی تھی تو ہم دونوں نے سوچا تھا کہ پہلا بیٹا فلسطین کی آزادی کیلئے وقف کردیں گے۔ مگر بچی پیدا ہوگئی۔ مسعود نے کہا میری یہ بچی اللہ کے لیے وقف ہوگی۔ جب پہلے بچے پر محنت کرلی جائے تو باقی بچے ٹھیک رہتے ہیں۔ انہوں نے سب بچوں کی تعلیم وتربیت پر بہت محنت کی خصوصاً مریم پر خاص توجہ دی۔ نومولود بچے نے پہلی بار گھر سے باہر جانا ہوتا تو بچے کو نہلا دھلا کر سب سے پہلے مسجد لے کر جاتے تاکہ بچے کا تعلق اللہ سے جڑا رہے۔ مریم سے اللہ تعالیٰ نے چھوٹی سی عمر میں بہت سا دین کا کام لے لیا۔ جب تک وہ دنیا میں رہی دین سے جڑی رہی اور دین کا کام کرتی رہی۔ گیارہ برس کی عمر سے لکھنا شروع کیا۔ اس کی کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں، لاشوں پہ رقص، تزکیہ نفس میں شکر کا کردار، چند آیات کی تفسیر، عمل صحابہ کے آئینے میں، مسلمانوں کا فکری اغوا، ہمارا نصاب تعلیم اور نصابی صلیبیں، نکاح کوئیز (Quiz)، کرکٹ اسلامی ثقافت کے تناظر میں، صلہ رحمی اور اس کے عملی پہلو، مریم کا ادبی کام بہت زیادہ ہے بچوں کی کتابیں، کتابچے، تنقیدی خطوط، پاک وہند کے رسائل پر ریسرچ کے علاوہ بہت سا کام ایسا ہے جو

ابھی چھپوانا ہے۔

س۔شہید بیٹے کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج۔ذوالاکرام باپ کالاڈلا بیٹا تھا۔ غیر معمولی طور پر ذہین تھا۔تاریخ کا طالب علم تھا۔ چودہ برس کی عمر میں اس نے معارف اسلامی والوں سے تاریخ کی بے شمار کتب لے کر پڑھیں۔اشتیاق احمد کے ناول اور مسلمان سائنسدانوں کے حالات زندگی کا دلچسپی سے مطالعہ کیا کرتا تھا۔ جب اس کی عمر سولہ برس کی ہوئی تو یہ جماعت الدعوۃ والوں کے ساتھ پشاور گیا اور جنگی مشقیں سیکھیں اور انہی دنوں مقبوضہ کشمیر میں چار سال تک رہا۔ اس کے جانے کے بعد اس کے ابو اور مریم یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہوئے۔ اسے ان کی وفات کی کچھ خبر نہ تھی۔ انہی دنوں اس نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ مدیحہ کی حناد سے شادی کر دی جائے۔(حناد میرا داماد اور مریم کے شوہر کا نام ہے) تب اسے شک ہوا کہ کہیں باجی فوت تو نہیں ہوگئی۔ جب وہ کشمیر میں جہاد کے لئے گیا اس وقت پاکستانی فوج کے ساتھ گیا۔فوجی ہیلی کاپٹر مجاہدین کو اوپر لے کر جاتے تھے وہیں بیس برس کی عمر میں جام شہادت نوش کیا۔

س۔یہ کون سے سن کی بات ہے؟

ج۔یہ جون ۲۰۰۲ء کی بات ہے۔

س۔کیا آپ آئندہ بھی کسی کو جہاد پر بھیجنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟

ج۔جی نہیں ہم تو اب اس کے بارے میں سوچتے بھی نہیں۔آجکل تو کھچڑی پک چکی ہے۔کچھ معلوم نہیں کون صحیح ہے اور کون غلط۔ہم ہر صورت میں پاکستان میں امن کے خواہاں ہیں۔

س۔بحثیت مسلمان اور پاکستانی شہری کے ہمیں کن باتوں کو مدنظر رکھنا چاہیے؟

ج۔ہمارا دین ہمارے اخلاق اور ہماری عادات کو بہتر بناتا ہے۔ہمارا دین تو ایک ہڈی بھی راستے میں پھینکنے کی اجازت نہیں دیتا۔کسی کو قانون کا شعور ہی نہیں ہے۔ قانون ہماری بہتری کیلئے بنایا جاتا ہے۔ گورنمنٹ کو مسائل میں پھنسانے والے ہم خود ہیں۔ ہمیں امن وسکون قائم کرنے کے لیے راستے خود طے کرنے ہیں۔سپیکروں کی آوازوں کو کمروں میں محدود رکھنا چاہیے۔اپنی سکیورٹی خود طے کریں۔خاص جگہوں پر جلسے کریں۔جلوس نکالنے کی ممانعت ہو۔یہ حکومتوں کے کام نہیں ہوتے کہ مذہبی جلسے جلوس تو ہم نکالیں اور

پولیس لوگوں کی حفاظت کرتی پھرے۔ دوسرے لوگوں کا امن وسکون غارت ہو۔ ہمیں ہر حال میں پرامن شہری کی طرح زندگی گزارنی چاہیے اور حکومت سے ممکنہ حد تک تعاون کرنا چاہیے۔

س۔ آپ کیا سمجھتی ہیں، بے لگام میڈیا کے اس دور میں بچوں کی تربیت کیسے کرنی چاہیے، کیا ٹی وی گھر سے نکالنا اس کا واحد حل ہے؟

ج۔ ٹی وی گھر سے نکالنا اس کا حل نہیں ہے۔ ہم پندرہ سال پہلے یہ بات کرتے تھے آج کل تو اس پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ آج موبائل فون کمپیوٹر ہر کسی کے پاس ہیں۔ چھ ماہ کا بچہ بھی اگر موبائل اس کے کان سے لگا دیں تو محظوظ ہوتا ہے اور ہوں ہاں کرتا ہے۔ ڈیڑھ سال کی میں عمر میں بٹن دباتا ہے اور تین برس کی عمر میں میسج کرنے لگ جاتا ہے۔ ان لایعنی چیزوں سے بچنے کا یہی طریقہ ہے کہ پہلے ہی پیش بندی کر لی جائے۔ والدین بچوں کو مفید چیزیں دیکھنے کی آزادی دیں۔ ٹی وی اور کمپیوٹر والدین سے اجازت لے کر بچے لگائیں ہمیں اپنے بچپن میں خود سے ریڈیو لگانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

بچوں کو دینی تعلیم ضرور دیں۔ معاشرے میں رہنے کے آداب، نکاح، حجاب اور دیگر چیزوں کے بارے میں معلومات بچپن سے ہی ہونی چاہئیں۔

س۔ آپ کیا سمجھتی ہیں، آپ نے جتنا کام زندگی میں کرنا تھا کر لیا یا ابھی اور بہت کچھ کرنا چاہتی ہیں؟

ج۔ اللہ تعالیٰ نے جتنا کام مجھ سے کروانا ہوگا میں اتنا ہی کروں گی۔ اللہ کا احسان ہے گھر بیٹھے بیٹھے کام ہو رہا ہے۔ بچوں کی صورت میں اللہ نے دست و بازو دیئے ہیں وہی کتابوں کی کمپوزنگ، ٹائٹل، چھپوائی سبھی کام کر دیتے ہیں، اگر کبھی گھر سے باہر جانا ہو تو خواتین لے جاتی ہیں اور چھوڑ بھی جاتی ہیں۔ میری دعا ہے اسی طرح کام چلتا رہے۔

س۔ لوگوں کا کون سا رویہ آپ کو دکھی کرتا ہے؟

ج۔ بہت سے لوگ مجھ سے فون پر مسئلے مسائل پوچھتے ہیں جس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے لوگوں کو دین کا علم بالکل واجبی سا ہے۔ اکثر دین دار گھرانوں کے لوگوں کو بھی دین کی الف بے کا بھی علم نہیں ہوتا۔

س۔ آپ کے بارے میں لوگوں کو شکوہ ہے کہ اپنی شاعری میں بہت مشکل الفاظ استعمال کرتی ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ کی شاعری عام فہم نہیں ہے۔

ج۔آپ نے بالکل درست کہا آپ اسے میری مجبوری سمجھ لیں۔ میں نے شاعری میں عربی اور فارسی کلام زیادہ پڑھا ہے۔میں نے عبدالعزیز خالد کو بہت پڑھا ہے شائد انکا اثر ہے۔نعیم صدیقی اور علیم ناصری کی شاعری بھی کافی مشکل ہے۔شادی کے بعد سات سال تک شعوری طور پر مشکل شاعری کی۔ جہاں کہیں مجھے نیا لفظ ملا میں نے وہ ارادتاً اپنے اشعار میں شامل کیا۔

س۔ نثر کے حوالے سے میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں آپ کے مضامین بے حد طویل ہوتے ہیں۔اس کی کوئی خاص وجہ؟

ج۔ میں پھر کہوں گی میری مجبوری ہے یا عادت ہے میں مختصر لکھ ہی نہیں سکتی۔ میں درس بھی طویل دیتی ہوں۔ چونکہ ادب کا وسیع مطالعہ ہے بولنے میں اختصار کر سکتی ہوں لکھنے میں نہیں۔

س۔آپ کو اپنا کون سا تعارف پسند ہے عالمہ، شاعرہ یا مصنفہ؟

ج۔عالم کا بہت بلند مقام ہوتا ہے میں تو کچھ بھی نہیں۔ شعروشاعری سے مجھے شروع سے شغف ہے۔میں بحثیت شاعرہ اپنی پہچان چاہتی ہوں۔ کس شعبہ میں کامیاب ہوں اس کا فیصلہ تو پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔

س۔آپ اپنے ادبی کام کے حوالے سے ہمارے قارئین کو بتائیں؟

ج۔ جب سے ہوش سنبھالا ادب سے ہی وابستگی رہی۔علمی کتب لوگوں کی معلومات کے لیے لکھیں تا کہ روزمرہ کے عام مسائل سے ان کی واقفیت ہو جائے دینی موضوعات پر کتابچے تقریباً ۲۰۰ کے قریب ہیں۔ میرے اشعار سن کر آپا جی ام زبیر نے کہا تھا آپ کا انداز نعیم صدیقی کا سا ہے یہ نثری نعت تھی۔ جب میری فصلِ عزائم چھپی تو اقبال کیانی صاحب نے کہا'' آپ کی کتاب پڑھ کر میں چاہتا ہوں میں بھی شاعر ہوتا۔'' شاعری میں مفصلِ عزائم ،خوشبو لفظ گلاب ،نعتوں کی کتب میں مدح محبوب، مدح محمود ابھی زیر طبع ہیں ان میں خصوصیت یہ ہے کہ یہ بغیر نقطوں کے نعتیں ہیں۔ دوسرا اردو حروف تہجی کے حساب سے ہر شعر الف سے شروع ہوتا ہے اور ب پر ختم ہوتا ہے اور یے تک یہ اشعار مکمل ہوتے ہیں اس طرح ان میں ۳۷ نعتیہ اشعار ہیں۔ بچوں کی نظموں کے چالیس پچاس مجموعے زیر طبع ہیں۔ بچوں کی کچھ کتب چھپ گئی ہیں ''منع کیا ہے پیارے نبیؐ نے، باغ میں ندی، آدھا

نکلا چاند،ممتا کی بولی، لوریاں، ایک دونی دو' میرا ایک درس ''کیوں اور کیسے لکھیں' الھدیٰ کی کلاس میں رکھوایا گیا تھا۔ادب، نثر، اصلاحات، اشعار کی بہت سی کتب زیرطبع ہیں۔

س۔حریم ادب میں کب اور کیسے آئیں؟

ج۔آپا جی زبیدہ بلوچ کی شاگرد طاہرہ شریف سے ملاقات ہوئی وہ میری ممانی کی ہمسائی تھیں ان کے بچوں کا آپس میں میل ملاقات تھا وہ مجھے آپا جی زبیدہ کے پاس لے آئیں جب میں اس بار حریم ادب کی محفل میں آئی چار لوگ تھے۔آپا جی زبیدہ بلوچ، طاہرہ شریف، گل رعنا مسعود اور میں۔میرا مستغفر ابھی صرف چار ماہ کا میری گود میں تھا۔ وہ مجھے سعیدہ احسن کے پاس چھوڑ گئیں۔طیبہ یاسمین کرسی پر بیٹھی تھیں ۔سعیدہ احسن نے میرا تعارف کروایا۔بنتِ مجتبیٰ مینا، بیگم زبیدہ اسعد گیلانی فرزانہ چیمہ سے ملاقات ہوئی ثمر احسن نے بنت الاسلام پر اپنا مضمون سنایا۔محترمہ بنت الاسلام کی وفات کو ابھی چند ماہ ہوئے تھے۔اس ادبی پروگرام میں تقریباً پندرہ بیس عورتیں تھیں۔سعیدہ احسن صاحبہ نے میرے حالات زندگی سے مکمل تعارف لیا اور کہا لگتا نہیں ہے کہ تم چھ بچوں کی ماں ہو جلدی شادی ہو جائے تو بچے بھی بہن بھائیوں جیسے لگتے ہیں۔میرا زندگی کا پہلا تجربہ تھا گھر سے باہر نکلنے کا۔میں خائف سی ایک جانب بیٹھی رہی۔وہاں میں نے اپنی نظم سنائی مینا آپا نے تبصرہ کیا کہ کلام کافی پختہ ہے۔سعیدہ احسن نے حوصلہ افزائی کی اور کہا آئندہ سب بچوں کو ساتھ لے کر آنا۔حریم ادب میں آنا میرے لیے سنگ میل ثابت ہوا۔میرے میاں نے میرا بھرپور ساتھ دیا اور یہاں آنے میں رہنمائی کی۔

س۔آپ کی زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ کون سا ہے؟

ج۔واقعہ وہی ناقابل فراموش ہوتا ہے جو معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہو۔میرے امیاں کا پہلے روز ہمارے گھر آنا مجھے ہمیشہ یاد آتا ہے۔دوسرا حریم ادب میں جانا بھی میری زندگی کا اہم واقعہ ہے۔

س۔آپ کی پسندیدہ نظم کون سی ہے؟

ج۔یہ تو وہی سوال ہے جیسے کوئی کہے آپ کو اپنا کون سا بچہ اچھا لگتا ہے۔یہی حال تحریر کا بھی ہے یہ بتانا مشکل ہے۔

س۔سب سے دکھی لمحہ کون سا تھا آپ کی زندگی میں؟

ج۔جس دن میرے میاں کی وفات ہوئی تھی یہ ایسا حادثہ تھا جس کا ازالہ نہیں ہوسکتا تھا۔مریم کی وفات کو ابھی دوماہ ہی ہوئے تھے کہ وہ چلے گئے۔مریم کی وفات پرلوگ آتے افسوس کرتے اس کی باتیں کرتے تو مجھے اچھا لگتا تھا مگر میاں کی وفات پر دل چاہتا کہ لوگ نہ آئیں۔مجھ سے کچھ نہ پوچھیں نہ ان کی باتیں کریں بس میں خاموش رہوں۔محترمہ ثریا اسما صاحبہ افسوس کے لیے آئیں تو میں لکھ رہی تھی۔انہوں نے کہا یہ اچھی بات ہے مصروفیت ہے اس سے غم ہلکا ہوتا ہے۔

س۔آپ نوجوان لڑکیوں کے لیے کسے رول ماڈل سمجھتی ہیں؟

ج۔انسان جس کو دیکھتا، پڑھتا اور سمجھتا ہے وہی اس کے لیے رول ماڈل بن جاتا ہے۔صحابیاتؓ کی سیرت کو مدنظر رکھنا چاہیے۔دورحاضر کی جن خواتین کی سوچ اور عمل دین دارانہ ہے ان کے ساتھ وقت گزاریں تاکہ ویسے ہی اثرات ان میں آئیں۔ حضرت انسؓ کو ان کی والدہ رسولؐ کے پاس لے گئی تھیں تاکہ ویسے اثرات ان میں آجائیں۔

س۔آپ آجکل کون سے رسائل میں لکھ رہی ہیں؟

ج۔میں عفت اور الصافات میں لکھ رہی ہوں۔ الصّافات نے مجھے اعزازی مدیرہ بھی بنا رکھا ہے۔

س۔آپ کو ہم نے ہمیشہ سادہ اور ساتر لباس میں دیکھا۔کیا آپ کو بناؤ سنگھار پسند نہیں؟

ج۔میرا مزاج شروع سے ہی سادہ تھا شادی کے بعد میاں نے بھی سادگی کو ہی پسند کیا۔انہیں میک اپ کی ہوئی عورتیں پسند نہیں تھیں۔وہ کہتے تھے میں نے فلمی دنیا میں اتنا میک اپ دیکھا ہے کہ اب دیکھنے کی حسرت نہیں۔انہوں نے ایک فلم میں یہ مکالمہ لکھا تھا مفہوم یہ ہے ''جو عورت میک اپ کرتی ہے وہ اپنے رب سے شکوہ کرتی ہے کہ تو نے مجھے اچھی شکل وصورت نہیں دی۔''

س۔کیا اسلام میں بناؤ سنگھار کرنا ناجائز ہے؟

ج۔بالکل بھی نہیں۔ایک خاص حد کے اندر رہ کر عورت اپنے شوہر کے لیے بناؤ سنگھار کرسکتی ہے۔اگر شوہر نہ بھی چاہے تب بھی اسے ہر وقت بنا سنورا رہنا چاہیے۔

س۔آپ پر انتہا پسندی کا لیبل ہے۔اسلام میانہ روی کا قائل ہے آپ اس بارے میں کیا کہیں گی؟

ج۔پہلے تو انتہا پسندی کے معنی جان لیے جائیں تو بہتر ہوگا۔اسلام سے پہلے کی اقوام میں عیسائی ترک

دنیا کو جائز سمجھتے ہیں دوسری جانب یہودی دنیا میں رہ کر سب کچھ سمیٹ لینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ان دونوں کے برعکس اسلام ہمیں میانہ روی کا حکم دیتا ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے ایسا فائدہ اٹھاؤ جو آخرت کیلئے بھی مفید ہو۔

س۔کیا ایک داعی کو عملی زندگی میں ایسا نظر نہیں آنا چاہیے کہ مبتدی آسانی سے دین پر چل سکیں؟

ج۔ایک چیز ہے اپنے لیے اصول طے کرنا دوسری چیز ہے دوسروں کیلئے اصول طے کرنا۔اسلام نے جس حد تک گنجائش دی ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے ،میرا لباس ، رہنا سہنا،خود اختیاری ہے۔یہ ذاتی تقویٰ میں آتا ہے۔جس حد تک کوئی بخوشی سیرت رسولؐ پر عمل پیرا ہو سکے اسے ہونا چاہیے اس کے لیے آپ کو مثال دیتی ہوں۔کچھ لوگ بھنی ہوئی بکری پکا رہے تھے جب بکری پک کر تیار ہوگئی تو وہ اسے حضرت ابوھریرہؓ کے پاس لے کر آئے اور کہا کہ آپؓ اسے ہمارے ساتھ تناول فرمائیں تو انہوں نے فرمایا نبی کریمؐ کو تمام عمر تین وقت کا پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہوسکا، میں اسے کیسے کھا سکتا ہوں۔

یہ تھی ان کی محبت آپؐ سے۔ ہر کوئی اسے اختیار بھی کر سکتا ہے اور نہیں بھی۔اچھے مکان میں رہنا، اچھا لباس پہننا، اچھا کھانا پینا حرام نہیں بشرطیکہ وہ سب حلال طریقے سے حاصل کیا گیا ہو۔ میرے پاس جو شاگرد لڑکیاں آتی ہیں۔وہ دینی مسائل سن کر حیرت زدہ رہ جاتی ہیں کہ ہم نے اپنی ماؤں سے تو بہت سخت احکامات سن رکھے ہیں اور آپ تو بہت آسان باتیں بتا رہی ہیں۔

س۔بتول کے قارئین کو کیا پیغام دینا چاہیں گی؟

ج۔مسلمان ہونے کے حوالے سے ذاتی اصلاح کیلئے قرآن وحدیث کا اتنا علم ہونا چاہیے کہ ہم اپنی زندگی میں پیش آنے والے حلال وحرام کو جان سکیں۔ نیز یہ کہ دور حاضر کے فتنوں سے اپنے آپ کو جس حد تک ممکن ہو بچانا چاہیے۔ یہ خطہ جس میں ہم رہتے ہیں اپنے ہم وطنوں اور حکمرانوں کے ساتھ ہمارا رویہ مصالحانہ، مشفقانہ اور ہمدردانہ ہونا چاہیے۔"الدّین النصیحۃ" خلاصہ لوگوں نے آپؐ سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا اللہ کی خیر خواہی، رسولؐ کی خیرخواہی مسلمانوں کے پیشواؤں، حکمرانوں کی خیرخواہی اور عام لوگوں کی خیرخواہی۔

سمیہ آپ سے بات چیت کرکے بہت اچھا لگا ۔آپ کا بہت بہت شکریہ۔

☆☆☆

سیر و سیاحت
(دوسری قسط)

صبیحہ نبوت

کچھ بوسنیا کے بارے میں

ایک دن میں نے دیکھا کہ ''جیو'' پر نیچے ایک پٹی چل رہی تھی لکھا تھا ''بوسنیا میں اردو کی کلاس کے لئے کرسی رکھ دی گئی ہے۔''

بڑی غیر متوقع سی خبر تھی۔ بار بار پڑھا۔ آنکھوں پر یقین نہیں آیا تو اپنے بیٹے شہاب کو فون کیا کہ ہم نے ٹی وی پر یہ خبر پڑھی ہے۔ وہ بھی اس خبر سے لاعلم تھا۔ لیکن اس نے بتایا کہ میں نے یونیورسٹی میں اردو کی کلاس شروع کی ہے اس کے بارے میں ہوگی۔ یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔

ویسے اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر سے شہاب کا رابطہ ہے۔ وہ جب بھی پاکستان آتا ہے تو علامہ اقبال کی کتابیں اور بچوں کی سی ڈیز لے کر جاتا ہے اور وہاں بوسنن زبان میں ان کتابوں کا ترجمہ کرواتا ہے کیونکہ وہاں پر لوگ علامہ اقبال کو بہت پسند کرتے ہیں ان کی شاعری کو سمجھتے ہیں اور سیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ تو مجھے معلوم تھا لیکن اردو کی کلاس شروع ہونے کی اطلاع ''جیو'' سے ہوئی۔ شہاب کی چھ سالہ بیٹی بھی بہت اچھی اردو بولتی ہے۔ علامہ اقبال کے بارے میں کافی معلومات ہیں ''لب پہ آتی ہے دعا'' بہت مزے لے کر سناتی ہے۔ ایک دن ناشتہ کے وقت بولی ''بابا ''میز'' کا ''تیز'' ہوگا نا'' میں نے کہا یہ کیا بات ہوئی تو شہاب نے بتایا کہ ان کو شاعری کرنے کا بہت شوق ہے اس لیے ردیف قافیے ملاتی رہتی ہے اور کہتی ہے یہی شاعری ہوتی ہے۔ اس کا چھ ماہ کا بھائی ہے جس کو کہتی ہے اسے میں ہی سنبھالوں گی ماما کے بس کی بات نہیں ہے۔ غرضیکہ خوب اردو بولتی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی لیکن اپنی ماں سے بوسنن یا انگریزی میں ہی بات کرتی ہے۔ بہو (عامرہ) بھی اچھی اردو بول لیتی ہے (عامرہ کا تعلق بوسنیا سے ہے، جب بوسنیا میں جنگ ہو رہی تھی تو یہ لوگ پاکستان آگئے تھے۔ تب ہم نے انہیں پسند کیا تھا)

اکثر یہ بچی مجھ سے سوال کرتی تھی ''اب آپ دوبارہ کب آئیں گی۔'' میں نے کہا ''پہلے جانے تو دو۔'' یہ سن کر اداس ہو جاتی پھر میں پیار کرتی اور کہتی

جلدی آجاؤں گی تو چہرے پر مسکراہٹ آتی۔ ہر وقت میرے ساتھ رہتی کہانیاں سنتی اور یوں مجھے مصروف رکھتی۔

عامرہ کے والد سول انجینئر ہیں۔ انہوں نے اپنا گھر خود بنایا ہے بلکہ ایک اور گھر بنا رہے تھے پہاڑ پر وہاں پر گھر بڑے بڑے پتھروں سے بنائے جاتے ہیں لوگ خود ہی سب کام کرتے ہیں۔ لیکن یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ ''ایک اور گھر پہاڑ پر بنا رہے ہیں جبکہ وہ ریٹائرڈ ہیں۔ عمر رسیدہ بھی ہیں مختلف امراض میں بھی مبتلا ہیں لیکن بہت محنتی انسان ہیں۔ کسی وقت فارغ نہیں رہتے۔ گھر کے چھوٹے سے حصے میں سبزیاں لگاتے ہیں اور بھی ہر کام کرتے ہیں جس گھر میں اب یہ لوگ رہتے ہیں چھوٹا سا ہے پہاڑ کے اوپر جو انہوں نے خود بنایا تھا وہ اتنا مضبوط ہے کہ جنگ کی گولا باری میں اس کو ذرا سا بھی نقصان نہیں ہوا۔

گھر میں چار کمرے ہیں۔ کھانے کے کمرے ہی میں باورچی خانہ ہوتا ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ ایک دیوار میں چولھا، اسی دیوار میں برتنوں کی الماری، الماری کے اوپر اوون لگا تھا جو آسانی سے کھولا جا سکتا تھا اس کے ساتھ ڈش واشر اس کے ساتھ تھوڑی سی جگہ چیزیں رکھنے کے لئے۔ بس یوں کہیے کہ ایک دیوار میں پورا باورچی خانہ دوسری طرف فریج یعنی آپ نے ہاتھ بڑھایا تو ہر چیز آپ کے ہاتھ میں اسی طرح ٹی وی لاؤنج اور دو بیڈ روم۔

سب گھر تقریباً اسی طرح سے بنے ہوتے تھے دیواروں میں ہی ہیٹر لگے ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے لیکن صاف ستھرے اور نہایت آرام دہ۔ میں تو حیرت سے دیکھتی ہی رہی۔ اس طرح خواتین بھی بے حد سلیقہ مند سادہ کھانے، مربعے، اچار چٹنیاں، بند گوبھی کا اچار میں نے پہلی دفعہ کھایا جو بے حد لذیذ تھا، کھانے کی میز پر میز پوش ضرور ڈالے جاتے ہیں جو کھانے کے بعد اٹھا لیتے ہیں کھانے سے پہلے کافی پیش کی جاتی ہے پھر کھانا اس کے بعد چائے۔ میں جس گھر میں بھی کھانے پر گئی وہاں یہی سب پیش کیا گیا۔

عامرہ کے ماموں وغیرہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں اپنی روایات اور تہذیب سے بے حد لگاؤ ہے...... یہی وجہ تھی کہ وہ جنگ کے دنوں میں بھی وہیں رہے۔ توپوں کی گھن گرج اور آگ کے شعلے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ لوگوں کو کٹتے اور مرتے ہوئے بھی دیکھا، بچوں، بوڑھوں، بیماروں کی آہ و فغاں بھی

سنی، ان کا اپنا اکلوتا بیٹا اس جنگ کی نظر ہو گیا۔ اب ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ ایک پڑھتی ہے دوسری شادی شدہ ہے۔ ان لوگوں کو نہ انگریزی آتی ہے نہ ہی اردو۔ لیکن مجھے ان سے ملکر بڑی خوشی ہوئی۔ جس محبت اور خلوص کا اظہار ان لوگوں نے کیا وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا ہم لوگ جو بات چیت کر رہے تھے وہ شہاب کے ذریعے سے ہوئی۔ یعنی وہ میری بات انکو بوسنیا میں بتا تا اور مجھے اردو میں، اس کے باوجود کسی غیریت کا احساس نہیں ہوا۔

خواتین سلائی کڑھائی خود کر لیتی ہیں۔ کروشیا سے بنے ہوئے میز پوش اور کڑھائی کے نادر نمونے، جو قابل دید تھے انہوں نے دکھائے۔ کھانے زیادہ تر بیک کر کے بنائے جاتے ہیں، کھانے سادہ ہوتے ہیں، سالن میں انجیر کا سالن بھی میں نے پہلی دفعہ کھایا۔

لوگ بہت سادہ طبیعت ہیں۔ میری سب سے پہلی ملاقات تھی لیکن ان کی آؤ بھگت اور محبت نے بہت متاثر کیا۔ ان کا سلیقہ اور کام دیکھ کر پرانے زمانے کی خواتین کا تصور ابھرا کہ کتنی سگھڑ ہیں۔ وہاں ہم نے ایک اچھرے جیسا بازار بھی دیکھا۔ جو سستا بازار کہلاتا ہے۔ گلی در گلی، غار در غار، جیسے کوئی بھول بھلیاں ہوں تپلی سی گلی جس کے دونوں طرف دکانیں، ہینگروں میں دیواروں کے ساتھ ساتھ کپڑے لٹکے ہوئے۔ مسکراتے چہرے خوش آمدید کرتے ہیں جن کا خلوص دیکھ کر دل چاہا کہ ان سے کچھ خرید لیا جائے۔ لہٰذا تھوڑی بہت چیزیں بچوں کے لئے خرید لیں۔ زیادہ تر کپڑے ہی تھے وہاں جا کر اپنا اچھرہ یاد آیا۔ لیکن نہ وہاں گندی نالیاں تھیں نہ ہی ننگے اور گندے بچے، نہ ہی کوئی مانگنے والا، نہ کہیں کوڑے کا ڈھیر۔ ہم گلی در گلی گئے لیکن فرق صاف ظاہر تھا، گندگی اور صفائی کا اور لوگوں کے خلوص کا۔ بہت سے بازار اور ہوٹل دیکھے، کھانے بھی کھائے جہاں حرام اور حلال کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ کام کرنے والی زیادہ تر خواتین ہی ہوتی ہیں۔

ہم ایک ہوٹل میں گئے جو پہاڑ پر بنا ہوا ہے۔ اس پہاڑ پر چشمہ بھی بہتا ہو گا لیکن عمارت بن جانے کی وجہ سے چشمے کا پانی ہر طرف سے نکلتا ہے، لگتا ہے پنچ کے نیچے سے پانی نکل رہا ہے، ہر کمرے ہر دروازے اور دیوار سے پانی نکل رہا ہے۔ پہاڑ کے نیچے دریا تھا تو وہاں سے پانی نکل نکل کر دریا میں جا رہا تھا کیا عجیب منظر تھا عقل بھی دنگ رہ گئی اور آنکھیں بھی کہ یہ سب کیسے بنایا ہو گا؟ کس نے بنایا ہو گا؟ قدرت کا

شاہکار جسے کسی انسان نے مزید خوبصورت بنادیا۔ وہ پانی نہ کبھی ٹھہرتا ہے نہ جمتا ہے بس ہرطرف سے رواں دواں ہے۔

بوسنیا میں بھی بے شمار لوگ غیرقانونی طریقوں سے داخل ہوجاتے ہیں۔ ایک دفعہ شہاب کے پاس UNO والوں کا فون آیا انہوں نے اپنے دفتر میں اسے بلایا شہاب نے مجھے کہا آپ بھی چلیں آپ کو ایک اورجگہ دکھاتے ہیں وہاں پر کیا ہوتا ہے۔

ہم دونوں آٹھ بجے گھر سے نکلے۔ وہ دفتر ان کے گھر سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ نو بجے دفتر پہنچنا تھا۔ دفتر میں داخل ہوئے، ہمارا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ میں شہاب کے ساتھ ہی تھی۔ وہ ہمیں ایک کمرے میں لے گئے، وہاں پر پانچ نوجوان برے حالوں میں ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ شہاب نے ان سے بات چیت کی۔ پتہ چلا کہ وہ بنگلہ دیشی ہیں جن کے پاس نہ پاسپورٹ تھے نہ شناختی کارڈ۔ ٹوٹی پھوٹی اردو کچھ پنجابی اور کچھ بنگلہ دیشی زبان میں انہوں نے شہاب سے بات چیت کی۔ اپنے وہاں سے نکلنے کی وجہ بتائی۔ ان کو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ وہ کہاں ہیں کیونکہ وہ ان پڑھ بھی تھے۔

شہاب نے پوچھا تم اپنے ملک سے کیوں بھاگے ہو؟ تو انہوں نے بتایا کہ ہم زمانے سے بے روزگار ہیں۔ ماں باپ بہت غریب ہیں۔ کوئی کاروبار نہیں ہے تو وہ پیدل چلتے ہوئے ہندوستان آئے اور نہ جانے کس طرح یہاں تک پہنچے تو بارڈر پر پکڑے گئے۔ ان کے پاس کوئی شناخت نہیں تھی۔ شہاب نے بات چیت کی تو پتہ چلا کہ وہ بنگلہ دیشی ہیں اور روزگار کی تلاش میں اپنے ملک سے بھاگے ہیں۔

اس طرح شہاب نے ان کا انٹرویو لینے کے بعد UNO والوں کو تسلی دی کہ یہ لڑکے دہشت گرد نہیں ہیں بلکہ مصیبت کے مارے ہیں۔ پھر ان کو کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ جہاں ان کو کھانا وغیرہ دیا گیا۔ یوں شہاب UNO والوں کے لئے مترجم کا کام بھی کرتا ہے۔

شہاب کا آٹھویں منزل پر گھر ہونے کی وجہ سے دور دور تک سارے نظارے بڑے واضح ہوتے تھے۔ ایک دفعہ میں فجر کی نماز کے بعد کھڑکی میں کھڑی تھی اور قدرتی نظاروں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک نیچے لان کی طرف بھی نظر گئی دیکھا کہ ایک آدمی اپنے کتے کے ساتھ گھوم رہا ہے کہ کتے نے اچانک گندگی کردی۔ اس آدمی نے دیکھا تو اپنی جیب سے ٹشو

نکالا گندگی کو اٹھایا اور قریب ہی رکھے ہوئے کوڑے کے ڈبے میں ڈال دیا۔ میرے لیے یہ سب بھی بڑا عجیب تھا، کیونکہ ہمارے ہاں تو لوگ کتوں کو سیر اکراتے ہیں جگہ جگہ گندگی کرتے ہیں بلکہ لوگوں کے گھروں کے دروازوں پر کرتے ہیں لیکن کبھی کوئی وہاں صفائی نہیں کرتا۔ اب اگر وہ بوسنین بھی نہ اٹھاتا تو کون اسے دیکھ رہا تھا جو اس کو کچھ کہتا۔ اس کے علاوہ وہاں کوئی دوسرا شخص تھا بھی نہیں۔ یہ سب تو میں نے دیکھا جس کا اسے تصور بھی نہیں ہوگا۔ مجھے اپنے ہمسائیوں کی لڑائی یاد آ گئی جب کتا ان کے گھر کے سامنے روز گندگی کرتا اور کہنے کے باوجود وہاں صفائی کا کوئی ذکر نہ ہوتا۔ اس بات پر ایک دفعہ دونوں کی خوب جنگ ہوئی اور تماشہ سارے محلے نے دیکھا۔

کاش کہ ہم مغرب سے جہاں بہت کچھ سیکھ رہے ہیں، یہ خوبی بھی سیکھ لیں اور اتنے ہی ذمہ دار اور بااخلاق ہو جائیں تو کیا وجہ ہے کہ ہم بھی کیوں نہ دوسروں کا خیال کرنے لگیں اور ہمارے ملک سے گندگی کے ڈھیر ختم ہو جائیں۔ ذمہ دار شہری ،مخلص اور ملنسار لوگ، چھوٹے چھوٹے آرام دہ گھروں میں سلیقہ اور دستکاری کے نادر ونایاب نمونے، لوگوں کی محبت......پھر پوتی کی پیاری پیاری اور معصوم آوازیں۔ ''اب کب آئیں گی؟'' کانوں میں یوں رس گھولتی ہے جیسا کوئی سریلا راگ ہو...... جیسے کوئل کی پکار ہو۔ اس کے ساتھ ہی دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔ کاش ساتھ رہنے کا وہی دور پھر سے آجائے۔ زمانے کی گردشیں اور حالات کی ستم ظریفی نے ماں باپ اور بچوں کے درمیان جو فاصلے پیدا کر دیئے ہیں۔ ہمارے بچوں کے بچے پاٹ دیں اور ہم ویسے ہی خوش اور مطمئن ہو جائیں جیسے پہلے تھے کیونکہ لگتا ہے اب زندگی انہیں کے گرد گھومنے لگی ہے۔ ان کا شعور، ان کے معصوم سوالات، ان کی محبت، ان کی یاد، ان کا خیال، ان کا تصور ہی زندہ رکھے ہوئے ہے۔ یہ سب ہم نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ شاید اس لیے کہ بچوں کی جدائی اور تنہائی کا زہر اس وقت ہماری رگوں میں اتنا گہرا سرائیت نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

کبھی ہیروں کو بھی مٹی میں ملا دیتے ہو

لیجیے! میری ماں کا ایک اور عکس ڈوب گیا
ایک باصلاحیت، ذہین، دراز قد، تنومند، مگر قسمت درمیانی سی لیے ایک اور شخص کی کہانی ختم ہوئی۔

''اب اصغر بھائی کیسے ہیں؟''

''ماموں جان کی طبیعت کیسی ہے؟''

جیسے سوالات اب کبھی نہیں دہرائے جائیں گے۔

اور جواب دینے والے کی کربناک خاموشی!

ایسا جواب بھی اب کبھی نہیں دہرایا جائے گا۔

ستم ظریفی ہے کہ بوڑھی خالائیں سرہانے بیٹھی دہائی دیتی ہیں کہ جن کی ضرورت نہیں وہ بیٹھے ہیں اور جن کی ضرورت تھی وہ رخصت ہوگئے۔ انہیں شاید معلوم نہیں کہ ضروری وغیر ضروری کی تقسیم ہمارے دل نہیں خدا کی ہستی کرتی ہے۔

آج موت کی زردی اوڑھے جو شخص سامنے لیٹا ہے وہ کبھی اتنا تنومند اور دراز قد تھا کہ اس کے پیچھے دروازے اوجھل ہو جاتے تھے۔ اُن کے قریب کھڑے لوگوں کو سر اٹھا کر اس سے مخاطب ہونا پڑتا تھا۔

نہ جانے وقت ظالم تھا کہ ان کی بیماری! جو بھی تھا بہر حال شہ سوار نے مقابلہ خوب کیا۔ ہار جانا معنی نہیں رکھتا جو بات اہم ہے وہ مقابلہ کرنے والے کا صبر اور بہادری! کہ ہارنا تو ہم سب کو ہے موت کے سامنے۔ کہ آدھی دنیا کا فاتح بھی اسکے سامنے ہار گیا تھا۔

''اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا'' پکار اسی لیے ہے۔ مگر جس طرح آخری آرام گاہ تک میرے ماموں جان پہنچے ہیں۔ بیماری سے لڑتے لڑتے دس سال گزر گئے۔ اف تک نہ کی۔

پوچھا جاتا طبیعت کیسی ہے۔ بخار میں تپ رہے ہوتے مگر ہاتھ اٹھا کر ''ٹھیک ہوں'' کا اشارہ کر دیتے۔

مجھے یاد ہے ان کے براؤن جہازی سائز گلاسز اور bell bottom شلوار کے ساتھ short shirt میں وہ وحید مراد دکھائی دیتے تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ اس قدر صفائی پسند کہ ایک مکھی تک اڑتی دکھائی دیتی تو فوراً سپرے کی بوتل اٹھا کر اسے بھگا

دیتے۔ پھر کیا تھا سارے گھر میں مکھی مار سپرے کی ناخوشگوار بو۔مگر بو برداشت کرو مکھی نہیں۔دن میں کئی کئی بار صحن دھلواتے۔ پودوں کو پانی ڈالنا اور سبز پتوں پر چھڑکاؤ کرنا ان کا معمول تھا پھر پتوں سے قطرے ٹپکتے بہت بھلے لگتے۔ گرمیوں کی سہ پہریں بہت خوشگوار ہوجاتی تھیں۔اس پس منظر میں لوہے کی گول پشت والی کرسیوں پر بیٹھ کر سہ پہر کی چائے بہت مزے کی ہوجاتی خصوصاً جب اس کے ساتھ باقرخانی پاپے، کیک رس، بیکری بسکٹ یا ایسی کوئی چیز شامل ہوجاتی۔شام کو سب بچوں کو ایک چارپائی پر یا فرش پر چٹائی بچھا کر کھانا کھلایا جاتا۔ پیالے کے لئے چھنا اور بالٹی کے لئے ڈول کے الفاظ آج بھی سماعتوں کو بھلے محسوس ہوتے ہیں۔

رات کو چھت کے صحن پر چارپائیاں قطار اندر قطار ہوتیں۔ سائیڈوں پر پنکھے چلائے جاتے اور ہم سب بچے ماموں جان سے کہانی سننے کے لالچ میں ان کی چارپائی پر براجمان ہوجاتے۔مگر ہمیشہ ایسا ہوتا کہ وہ کہانی شروع کرتے اور ہم انکی کمر پر خارش کرتے یا پاؤڈر لگاتے اس امید پر رہتے کہ کب کہانی ختم ہو۔مگر ان کی کہانی کبھی ختم نہ ہوتی۔حتیٰ کہ ہم بڑے ہوگئے۔

اور وہ معذوری کی حالت میں بستر سے جا لگے۔ اور آج یہ حال ہے کہ ہاتھ اٹھا کر مکھی نہیں اڑا سکتے۔کھانا نہیں کھا سکتے۔اف یہ میرے ماموں جان! ان کی حالت دیکھ ہم سب کڑھتے رہتے تھے۔کبھی وقت تھا کہ وہ گھر آ کر آرام کر رہے ہوتے تو ہم سب بچوں کی جرات نہ تھی کہ ان کے قریب شور کریں، وہ ڈرا دھمکا کے بھگا دیتے تھے اور بہت بارعب بھی تھے۔ اپنے آرام اور صفائی پر وہ کمپرومائز نہیں کرتے تھے۔

تو پھر ماموں جان! آج آپ کو ہمارا شور کیوں سنائی نہیں دے رہا۔آپ آنکھیں کھول کر ہمیں ڈانٹ کیوں نہیں دیتے کہ رونا بند کردو۔ میری نیند خراب ہوتی ہے۔لیکن شاید آپ وہاں جا چکے ہیں جہاں کوئی آواز آپ کے آرام میں خلل نہیں ڈالے گی، جبھی تو عدنان آپ کے رخصت ہونے کے بعد آپ کے بستر پر لیٹا آپ کے بستر کی چادر اور تکیے پر بار بار ہاتھ پھیرتا ہے اور اپنے بیٹوں کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے ''آج یہ بستر بھی خالی ہوگیا ہے۔اب خوب شور کرو۔تمہارے شور سے پریشان ہونے والا اب نہیں رہا۔''

عدنان کا غم بانٹنے والوں نے جب اسے کہا کہ تم نے باپ کی بہت خدمت کی تمہیں اس کی جزا ملے گی۔تو وہ

کہنے لگا ''میں نے کیا کرنی تھی خدمت۔ خدمت گزار تو وہ تھے۔ وہ کبھی بھی بوجھ نہیں تھے۔ ابھی تو کل میں ان کی اکیس ہزار پنشن لے کر آیا ہوں۔ وہ بستر پر لیٹے گھر کو چلا رہے تھے۔ وہ اپنی دوائیوں اور گھر کے بل خود ادا کرتے تھے۔ وہ اپنی ضروریات زندگی کے لئے کسی کے محتاج نہ تھے۔ کوئی یہ نہ کہے کہ میرے ابو معذور تھے۔''

جب ماموں جان کی جان گئی تو ممانی جان نے چیخ مار کر ''ہائے بھائی حمید، ہائے بھائی اسحٰق'' کہا تھا یہ دونوں ممانی جان کے لئے کیا اور کیسا مقام رکھتے تھے اس کی وضاحت میں جانا اس وقت مشکل ہے۔ یہ دونوں رشتے ہم سے جدا ہو چکے ہیں اور جب ایک نیا زخم لگتا ہے تو پچھلوں کی یاد بھی ضرور آتی ہے۔ ایک دم بیوگی کے احساس نے انہیں آلیا ہوگا۔ بیٹوں کے سر پر ہاتھ پھیرتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں۔ ''ہائے عمر، اس کو فلائیٹ نہیں مل رہی۔ یہ دو قدم پر ہے دبئی مگر افسوس کہ ابو کا منہ نہیں دیکھ سکے گا۔'' بار بار کہتی تھیں کہ اس کا انتظار کر لیتے ہیں۔ جیسے ہی چشتیاں سے دس گھنٹے کا سفر کر کے بیٹیاں چارپائی کے پاس پہنچی ہیں بڑی لاڈلی پہلوٹھی کی بیٹی صفانہ نے چیخ مار کر ''ابو جی'' کہا ہی تھا کہ جنازہ اٹھالیا گیا کہ جانے والا کس قدر بے تاب تھا۔ وہ جی بھر کر منہ بھی نہ دیکھ سکیں۔ اس چہرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو جانا تھا۔

بھانجا تقی دیر تک منہ سے کفن ہٹائے ان کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے ان جدائی کے لمحات میں ان کے آخری دیدار میں کس چیز کی تلاش تھی اسے۔ آج سے ٹھیک گیارہ سال پہلے یہی ماہ اکتوبر تھا۔ ابو کا جنازہ تیار تھا۔ بڑے بھائی نے چھوٹے سے کہا تھا یہ چہرہ غور سے دیکھ لو۔ آخری دیدار کر لو۔ آج کے بعد یہ کبھی نہیں دکھائی دے گا۔ آج بھی زبان حال یہی پکار رہی تھی مگر پہلو میں آج صفی نہ تھا، عمر نہ تھا۔ وہ دونوں دبئی میں اس غم کو منا رہے تھے۔

لوگ فالج زدہ شخص کے لئے کہتے ہیں کہ ''اللہ اس کو لے جائے!'' مگر مجھے معلوم ہے، ہم میں سے ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ اللہ ان کو ایک بار پھر اپنے پاؤں پر کھڑا کر دے۔ اور ایک بار وہ ہمارے یہاں آئیں اپنی ہمشیرہ کے گھر۔ وہی Sunglasses لگائے ہوں اور دروازے سے اندر داخل ہوں تو دروازہ اوجھل ہو جائے اور ہم ماموں جان کہہ کر بھاگتے ہوئے ان کی طرف جائیں۔ پھر

دیر تک ان کے ساتھ لگ کر کھڑے رہیں۔صرف ایک بار ایسا ہو کہ وہ جانے لگیں تو ہم ضد کر کے ان کے ساتھ چلے جائیں۔صرف ایک بار ایسا ہو کہ وہاں بڑے bedroom کی الماری میں نانی اماں کے مرتبانوں میں چھپائے ڈرائی فروٹ بیکری بسکٹ tangاور اس طرح کے دیگر لوازمات ماموں جان کی مدد سے بے وقت کھا سکیں۔اور پھر سب کے ساتھ یہ چیزیں وقت پر بھی کھا سکیں اور ڈبل گیم کھیل کر اندر ہی اندر خوش ہوں۔صرف ایک بار ایسا ہو کہ ہم ماموں جان کے وی سی آر پر Mr Chips'Knight Rider اور دیگر مزے مزے کے کارٹون دیکھ سکیں۔ صرف ایک بار ایسا ہو کہ ہم ان کی غیر موجودگی میں ان کی میوزک والی البم نکال کر ان کی تصاویر دیکھ سکیں۔ ان کی البم الف لیلوی قسم کا کردار لگتی تھی اور وہ کسی کو بھی ہاتھ تک لگانے نہیں دیتے تھے۔صرف ایک بار ایسا ہو کہ بالائی کمرے کی کھڑکی سے کھیتوں کے پار ریلوے لائن سے ٹرین وسل بجاتی اور شور مچاتی گزرے اور نانی اماں ادھر انگلی کا اشارہ کر کے کہیں ''دیکھو تمہارے ماموں جان کی ٹرین گزر رہی ہے۔'' وہ ٹرین کا گزرنا بھی الف لیلوی کردار تھا۔ہم پہروں چھت پر کھڑے اس کے گزرنے کا انتظار کرتے اور جونہی وسل سنائی دیتی ہم اچھل اچھل کر جھوم جھوم کر اسے دیکھتے اور جب تک وہ گزر نہ جاتی آنکھیں ساکت کیے اسے تکتے رہتے۔ان کی البم کی طرح ان کی چائے کی جہازی سائز پیالی بڑی مشہور تھی۔ وہ ریل کے ڈرائیور تھے اس لیے کڑک چائے کی پیالیاں پینا اور گھر آ کر دیر تک آرام کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ پھر وہ پشاور اور دیگر علاقوں کے فروٹ ،ملبوسات اور دیگر لوازمات لے کر آتے تھے۔نانی اماں کہا کرتی تھیں کہ اصغر جب بچہ تھا تو برتن بہت توڑتا تھا اور برتن ٹوٹنے کی آواز سننے کے لئے انہیں خود گرا کر توڑتا تھا اور جب بڑا ہوا تو اسی قدر نفیس اور بے شمار برتن مختلف علاقوں سے لا کر بھی دیئے۔افسوس کہ اب دوبارہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔آپ کو رخصت کرنے کے بعد آج صبح اسمبلی میں کھڑے ہو کر بچوں کے منہ سے لب پہ آتی ہے دعا،نہیں سنا جا رہا آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔دھیان بار بار گزرے سالوں کی طرف جاتا ہے۔ جب میں خود ایک طالب علم تھی اور سائنس پڑھنے ننھیال گئی تھی تب گاؤں میں سائنس نہیں تھی۔اور جب کیمسٹری کی ویلنسی اور قوت کشش کی سمجھ نہیں آتی تھی، وہ کس طرح

ہر ٹاپک کو اپنی طرف سے مثالیں دے کر سمجھا کر آسان بناتے تھے۔گھنٹوں ایک ٹاپک پر بول کر اس کا ہر پہلو ذہن نشین کرواتے تھے۔ بیالوجی میں آنکھ کے جھپکنے کو گاڑی کے وائپر سے تشبیہ دے کر سمجھایا کہ جیسے گاڑی کی سکرین پر پانی گرے تو وائپر حرکت کر کے اس کو صاف کرتے ہیں ساتھ ہی گرد وغیرہ بھی نکل جاتی ہے یونہی آنکھ کی ٹیوب سے ہر وقت ایک آنسو نکلتا ہے۔پلکیں جھپک کر اس آنسو کو عدسے پر پھیلا دیتی ہیں جس سے آنکھ کی فرکشن کم ہوتی ہے اور گرد کی صفائی ہوتی رہتی ہے۔یہ اور اس طرح کے کئی مشکل ٹاپک انہوں نے یوں سمجھائے کہ آج تک یاد ہیں۔انہیں Oven میں گرم کیا کھانا ناپسند تھا۔کہتے تھے بجلی کی لہریں کھانے کو نقصان پہنچاتی ہیں۔غذائی اجزاء damage ہو جاتے ہیں اس لیے توے پر گرم کیا پسند کرتے تھے۔بعض اوقات ان سے کچھ پوچھتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ ایک ہی موضوع پر بہت بولیں گے اور وقت بہت لگ جائے گا۔انکی لکھائی مبالغہ آرائی حد تک پیاری تھی۔

ماموں جان اسحٰق کی وفات پر میں نے تحریر لکھی جو بتول میں شائع ہوئی انہیں پتہ چلا تو منگوا کر پڑھی اور خوش ہوئے کہ میں لکھتی ہوں، مجھے اپنے پاس بلوایا اور اپنے دور کے بہت سے قصے، ریلوے کی نوکری کے تجربات اور حیرت انگیز واقعات سنائے۔بہت دیر باتیں کرتے رہے اور کہا کہ ان پر ضرور لکھنا۔ میں ڈائری اور پن ساتھ لے کر گئی تھی اہم باتیں نوٹ کر لی تھیں۔اگر ادارہ بتول نے ساتھ دیا تو ان پر لکھنے کا ارادہ ہے۔

ماموں جان کے قُل پر میں ان کی ایک چیز اٹھائی لائی تھی اور میں نے عدنان سے کہا تھا میں ماموں جان کی ایک چیز تمہاری اجازت کے بغیر لے کر جا رہی ہوں۔ اس نے پوچھا لیکن میں نے بتایا نہیں۔ اور میں نے اسے کہا کہ خود اندازہ لگا لینا۔اور وہ الف لیلوی کرداران کی جہازی سائز البم میوزیکل البم تھی۔اس میں میری امی ، ماموں جان، نانا، نانی کی تصاویر، میری نانی کا وسیع وعریض لان، گلاب اور موتیے کے پھول، دن کا راجا، کونے میں لگی رات کی رانی، پرانا کچن، کچا صحن ، دودھ رکھنے کی ٹوکری، کچی چوکور تنور، چھنے، ڈول، شادی کی تصاویر، پہلی بیگم کی گوٹے لگے لہنگے میں تصاویر اور وہی انار جس کے پھل کے گرد غلاف لپیٹ دیئے

جاتے۔اس البم میں میرا ننھیال ہے۔ یہ البم میرے اندر بولتی ہے کیونکہ اس میں میرا ننھیال بولتا ہے۔

نکتہ نقش بناتے ہو مٹا دیتے ہو
جانے کس جرم تمنّا کی سزا دیتے ہو
کبھی کنکر کو بنا دیتے ہو ہیرے کی کنی
کبھی ہیروں کو بھی مٹی میں ملا دیتے ہو

☆☆☆

محشرِ خیال

زہرا نہالہ-فیصل آباد

نومبر کا پرچہ ملتے ہی سب سے پہلے ''وہ ایک انداز تیرا'' کی آخری قسط پڑھی۔ نصرت یوسف صاحبہ ما شاء اللہ بتول کے لکھاریوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں۔ان کا پچھلا سلسلہ وار ناولٹ ''کہیں چاند راہوں میں کھو گیا'' بھی بہت اچھا اور دل کو چھو لینے والا تھا اور اب ''وہ ایک انداز تیرا'' میں بھی انھوں نے دو موضوعات کو بڑی اچھی طرح سمویا ہے۔ پہلا موضوع تو زبان کا غیر محتاط استعمال ہے جو دلوں کو پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ برے القاب سے پکارنا اور تمسخر اڑانا کس طرح افراد کی زندگی پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے اور دوسرا موضوع جو بہت اہمیت کا حامل ہے وہ خود نصرت کے الفاظ میں ''علی نواز'' ''میمونہ'' کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''منگنی یا شادی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسان کو دوسرا کوئی پسند آ ہی نہیں سکتا۔مخلوط اداروں سے یہ ہی فساد جنم لیتا ہے۔ یہ ہم انسانوں کی حماقت ہے کہ آگ سے کھیلنا چاہتے ہیں اور دامن بھی بچا رہے،اس کی بھی تمنا رکھتے ہیں۔''

مخلوط اداروں میں پڑھنا کس درجہ فساد انگیز اور خطرات سے پر ہے اس کے باوجود دن بدن اس کی کراہیت کم سے کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ دیندار گھرانوں کی بچیاں بھی اپنے با حجاب ہونے کی وجہ سے ایسے تمام اداروں میں جانے کو غیر شرعی سمجھنے کے بجائے عین جہاد سمجھتی ہیں۔ حالانکہ کسی بھی چیز کا کثرت سے ہو جانا اس کے درست ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی۔میرا دل چاہتا ہے کہ بتول میں لکھنے والی فاضل بہنوں میں سے کوئی خاتون اس روز افزوں مسئلے پر ضرور روشنی ڈالے کہ خواتین کے علیحدہ ادارے موجود ہوتے ہوئے دیندار با پردہ بچیوں کا ان کو چھوڑ کر مخلوط اداروں میں جانا کیسا طرزِ عمل ہے؟

اب آتے ہیں باقی پرچے کی طرف۔محشر خیال میں گوجرہ کی بہن رفعت اشتیاق کا تفصیلی تبصرہ پڑھ کر بے اختیار ان کی مغفرت اور درجات کی بلندی کی دعا

نکلی۔ چند ہفتے پہلے ہی قانتہ رابعہ نے بتایا تھا کہ رفعت بہن ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں خالق حقیقی سے جا ملیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آخر وقت تک کارِخیر میں لگے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے گھر میں بہترین مقام عطا فرمائے (آمین)

دیگر مضامین میں آسیہ راشد صاحبہ کا مضمون ''آپا ارشاد بتول کی یادیں'' ڈاکٹر گوہر مشتاق کا ''نوجوانوں میں سوشل نیٹ ورکنگ کا رجحان'' بہت اچھے لگے۔ شاہدہ ناز قاضی کا افسانہ ''جھیل اور پرندہ'' پڑھ کر لگا جیسے پہلے بھی پڑھا ہوا ہے۔

شمیم فاطمہ نثر کے ساتھ ساتھ نظم کے میدان کی بھی شاہسوار ہیں یہ انکشاف خوشگوار تھا۔ اداریہ میں اقبالؔ اور خورشید رضوی دونوں کے اشعار کا انتخاب بہت خوب تھا۔ تمام پرچہ الحمدللہ معیاری اور دلچسپ تحریروں سے مزین ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام لکھنے والوں کی سعی کو قبول فرمائے۔ سب لکھنے والوں کے اخلاص اور اوقات میں برکت عطا فرمائے۔ آمین۔ ماہنامہ بتول اور اس کی ٹیم کے تمام افراد اسی طرح خالصتاً اللہ کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لیے قلمی جہاد کے میدان میں سرگرم عمل رہیں۔ آمین ثم آمین۔

☆ زہرا! دعاؤں کے لیے بے حد شکریہ! شمیم فاطمہ کی شعری نگارشات تو گزشتہ چار برس سے بتول میں چھپ رہی ہیں بلکہ انھوں نے آغاز شاعری سے ہی کیا تھا۔

☆☆☆

دانت قدرت کا عطیہ

انسان جو بھی غذا کھاتا ہے پہلے چوکیدار کے طور پر دانت اسے چبا کر معدہ کے حوالہ کرتے ہیں۔ عام محاورہ ہے دانت اچھے تو صحت اچھی......! یہ ضرب المثل نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔

آج کے دور کے انسان نے ہر کام فطرت کے منافی شروع کر رکھا ہے، رات کو دس گیارہ بجے کھانا ایک فیشن بن چکا ہے۔ دن بھر کا تھکا انسان کھانے کے فوری بعد صوفہ یا بستر پر ڈھیر ہوجاتا ہے۔ غذا کے ریزے دانتوں میں ہوتے ہیں وہ سوجاتا ہے۔ صبح کو دیر سے اٹھنا بھی دیرے سے سونے کا نتیجہ ہے۔ انسان بھاگم بھاگ کلی کرتا ہے کبھی خالی معدہ اپنے کام پر روانہ ہوجاتا ہے، چائے کا ایک کپ پیا اور کام شروع......!

اس سارے عمل میں دانتوں کی صفائی کی کوئی اہمیت نہیں۔ چھوٹی عمر کے بچے ٹافیاں اور ٹکیاں کھا کر دانتوں کی بربادی کرلیتے ہیں۔ عمر رسیدہ لوگوں کو فرصت کہاں...... قدرت کے یہ موتی اور ان کے گرد مسوڑھے بیمار ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔

گندے دانتوں بیمار مسوڑھوں اور اکثر پیپ یا خون آلود دانتوں سے چبائی جانے والی غذا میں یہ زہریلا مواد کھانے میں شامل ہوکر معدہ میں جاتا ہے، آج کے دور میں معدہ کی تیزابیت، السر اور دیگر امراض اسی لاپروائی کا نتیجہ ہیں۔

جب ہمارے دانت صاف ہوں اور صاف صالح غذا معدہ میں جائے تو صحت برقرار رہتی ہے۔ دانتوں کی صفائی کے لئے انسان پھر مسواک کی طرف آرہا ہے۔ پیارے نبی کریم ﷺ نے متعدد احادیث میں مسواک کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ دانتوں کی صفائی سے ہم سنت پر عمل کرکے دین و دنیا کی بھلائی سمیٹ سکتے ہیں۔ دانتوں کی صحت کے لئے چند نسخہ جات لوگوں کی بھلائی کے لئے ہیں۔

ا۔ پوست، اخروٹ (جلاکر) (۱۰، ۱۰ تولہ) بادام کے چھلکے (جلاکر) (۱۰ تولہ) پھٹکڑی سفید (۵ تولہ) نمک سفید (۵ تولہ) بطور منجن استعمال کریں۔

۲۔استعمال شدہ لیموں کے چھلکے خشک کرلیں۔۱۰ تولہ چھلکا کیکر،۵تولہ پھٹکڑی بریاں،۵تولہ نمک خوردنی،تمام ادویہ کا منجن تیار کرلیں۔

۳۔اگر مسوڑھوں سے خون آرہا ہوتو نمک شیشہ باریک کر کے کپڑ چھان کرلیں۔میدہ کی طرح باریک ہو۔چٹکی بھر نمک چند قطرے روغن جرجیر (جواں کا تیل) ڈال کر بطور پیسٹ ملیں اور چند دنوں میں صحت یاب ہوکر دعا دیں۔

۴۔تازہ مسواک کیکر، شیشم، پھلاہی، سکھ چین وغیرہ مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔ان کو ٹوتھ پیسٹ پر ترجیح دیں۔

☆☆☆

وہ ایک فرد نہیں استعارہ تھا

عبدالقادر ملا، اگر محض ایک فرد ہوتا تو اس کا صلیب پر جھول جانا نظرانداز کر دیا جاتا۔ اگر وہ صرف ایک صحافی ہوتا تو بھی نظرانداز کیا جاسکتا تھا کہ اس عہد میں اہل صحافت کی زندگیاں کوئی جنس گراں مایہ نہیں رہیں۔ وہ جماعت اسلامی کا ایک اہم سیاسی رہنما ہی نہیں، ایک علامت ایک استعارہ تھا۔ پاکستان کی علامت، پاکستانیت کا استعارہ۔ علامتوں اور استعاروں کے نام کچھ بھی ہوں، ان کی شناخت کسی نظریئے، کسی اصول، کسی آدرش اور کسی مقصد حیات سے ہوتی ہے۔ اٹل حقیقت یہ ہے کہ نہ علامتیں فنا ہوتی ہیں، نہ استعاروں کو پھانسی دی جاسکتی ہے۔ البتہ علامتوں اور استعاروں کا سینہ چھلنی کرنے والے گروہ ضرور ملامتوں اور نفرتوں کا نشانہ بنے رہتے ہیں۔

عبدالقادر کا جرم یہ تھا کہ اپنے وطن پر ٹوٹ پڑنے والی ایک قیامت میں اس نے ایک محبّ وطن پاکستانی کا کردار ادا کیا۔ بیالیس برس پہلے وہ جوان تھا۔ اس کی رگوں میں دوڑتے گرم لہو نے بجا طور پر لاتعلقی کو گناہ جانا۔ وہ ایک سیاسی جماعت کا کارکن تھا۔ اس کی جماعت اسلام اور متحدہ پاکستان کے نعرے پر انتخابات میں حصہ لے رہی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ انتخابی مہم اور جمہوریت کے نام پر ایک سرکش گروہ نے کیونکر دوسری جماعتوں کو دبوچ لیا ہے۔ اس کی جماعت کے امیر، سید مودودی پلٹن میدان میں جلسہ کرنے آئے تو حسینہ واجد کے باپ کی جماعت نے حملہ کر کے تین افراد کو ہلاک کر دیا۔ سید مودودی جلسہ گاہ تک نہ پہنچ پائے۔ عبدالقادر ہاتھ میں پاکستان کا سبز ہلالی پرچم اٹھائے، پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا تا رہا پھر اس نے سرحد پار بیٹھے ایک روایتی دشمن کو دیکھا جو ہتھیار تیز کر رہا تھا پھر اس نے بھارت کی آغوش میں پلنے والی مکتی باہنی کے انسانی سوز مظالم دیکھے۔ ایسے میں اس نے وہی کردار ادا کیا جو ایک سچے اور پکے پاکستانی کو کرنا چاہیے تھا لیکن وقت کا فیصلہ اس کے خلاف تھا۔

عبدالقادر ملا ہار گیا، مکتی باہنی جیت گئی۔ بھارت فتح مند ٹھہرا، پاکستان دولخت ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا پاکستانی پرچم، یکا یک کپڑے کا نامطلوب پارچہ بن کر اجنبی ہوگیا۔ اس کے حصے کا پاکستان، بنگلہ دیش بن گیا۔ وہ جس فوج کے شانہ بشانہ بھارت اور مکتی باہنی سے لڑ رہا تھا، وہ فوج بے مہریٔ حالات کے ہاتھوں شکست کھا گئی۔ جنرل نیازی نے جگجیت سنگھ اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ قیدی بھارت کے بندی خانوں کو چلے گئے۔ عبدالقادر ملا وہیں رہ گیا۔ اس کی کتنی ہی راتیں بے خواب رہی ہوں گی۔ اس کے دل ودماغ میں جانے کیسے کیسے طوفان اٹھے ہوں گے لیکن اس کا تعلق ایک جماعت سے تھا۔ تلاطم تھما تو اس کی جماعت کی طرح اس نے بھی اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرلیا کہ اب اس کے وطن کا نام پاکستان نہیں، بنگلہ دیش ہے۔ اس نے جان لیا کہ اب اسے سبز ہلالی پرچم کو نہیں، سرخ سورج والے جھنڈے کو سلام کرنا ہے۔ زمینی حقیقتیں بڑی سخت جان، بڑی منہ زور ہوتی ہیں۔ آنکھیں بند کرلیں تو بھی صاف دکھائی دیتی رہتی ہیں۔

عبدالقادر ملا نے بھی دل ودماغ کی شورش کو تھپکیاں دے کر سلا دیا۔ وہ پاکستانی کے بجائے بنگلہ دیشی بن گیا۔ اب اس کی شناخت یہی تھی۔ بنگلہ دیشی شہری کے طور پر اس کا شناختی کارڈ بھی بن گیا اور پاسپورٹ بھی۔ وہ ڈھاکہ پریس کلب کا عہدیدار چنا گیا۔ دوبارہ وہ پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہو۔ بنگلہ دیش کی پارلیمنٹ میں بیٹھے اس نے کبھی نہ کہا کہ اسے پھر سے پاکستان میں ضم کردو۔ اس نے کبھی نہ کہا کہ وہ آج بھی ''پاکستانی'' ہے۔ اس نے کبھی اپنی شیروانی پر پاکستان کا چھوٹا سا جھنڈا نہ لگایا۔ وہ جانتا تھا کہ اب وہ بنگلہ دیشی ہے۔ اس کی جماعت نے بھی یہی راستہ چنا۔ عبدالقادر ہی کی طرح پروفیسر غلام اعظم جیسے مرد جلیل وجمیل نے بھی پاکستان کی جنگ لڑی تھی لیکن بوڑھے پروفیسر نے بھی تسلیم کرلیا کہ تاریخ کروٹ لے چکی ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کو بنگلہ دیش فوج کے سپرد کردیا جو بریگیڈیئر کے بڑے منصب تک پہنچا۔ تاریخ کے ایک خاص موڑ پر اپنے وطن کی سلامتی کے لئے کردار ادا کرنے والے ان سب لوگوں نے نئے موسم کے نئے تقاضوں کو قبول کرلیا۔

حسینہ واجد ایک منتقم مزاج، چڑچڑی، فتنہ گر عورت ہے۔ وہ کبھی ایک لیڈر نہ بن سکی۔ برسوں قبل میں نے ایوان صدر میں، صدر رفیق تارڑ سے اس کی گفتگو سنی تو

دنگ رہ گیا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ یہ بنگلہ دیش کی وزیراعظم نہیں، بھارت کا کوئی انتہاپسند سفیر بول رہا ہے۔ نہ جانے یہ اس کی سیاست کا تقاضا ہے یا سینے میں بل کھاتی کدورت، کہ جماعت اسلامی اس کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ نوے سالہ پروفیسر غلام اعظم کو عمر قید کی سزا سنادی گئی۔ نام نہاد جنگی جرائم کا نام نہاد ٹربیونل، حکومتی ایما پر متعفن فیصلے صادر کررہا ہے۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن نے بھی آواز اٹھائی کہ یہ ٹربیونل قانون وانصاف کے تقاضوں کے منافی ہیں۔ دوججوں کے درمیان ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو بھی منظر عام پر آچکی ہے ایک جج استعفیٰ دے کر گھر جاچکا ہے۔ اس بے چہرہ ٹربیونل کو بھی ایسی کوئی شہادت نہ ملی کہ عبدالقادر ملا کو موت کی سزا سنادی جاتی۔ سو عمر قید کا فیصلہ صادر ہوا۔ سپریم کورٹ میں اپیل ہوئی اور قید پھانسی میں بدل گئی۔ موت کی سزا کے لیے صرف ایک شخص کی گواہی کو بنیاد بنایا گیا۔ ایسا شخص جس نے تین مختلف مواقع پر تین مختلف ومتضاد بیانات دیئے۔

بنگلہ دیش کے عام انتخابات سر پہ کھڑے ہیں۔ انتخابی کامیابی کے لئے ایسے شرمناک ہتھکنڈے صرف مجیب الرحمٰن کی بے ہنر بیٹی ہی کو زیبا ہیں۔ کیا اسے یاد نہیں کہ مکتی باہنی نے کیا مظالم ڈھائے تھے؟ کیا وہ نہیں جانتی کہ پاکستان کی کیسی کیسی علامتوں کے ساتھ کس طرح کی بربریت برتی گئی؟ کیا وہ نہیں جانتی کہ تین لاکھ کے لگ بھگ ''بہاری'' آج بھی کس طرح کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں؟ کیا اسے کسی نے نہیں بتایا کہ اس طرح کی منتقم مزاج خوں آشامی اب سکہ رائج الوقت نہیں رہی؟ وہ آگ سے کھیل رہی ہے اور آگ سے کبھی پھول نہیں کھلا کرتے۔

حکومت پاکستان کوئی باضابطہ ردعمل تشکیل ہی نہ دے پائی۔ دفتر خارجہ کے بابو یہ کہہ کر سرخرو ہوگئے کہ یہ بنگلہ دیش کا اندورنی معاملہ ہے۔ کبھی کبھی شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ وزیراعظم نواز شریف ابھی تک کاروبار حکومت پر اپنی مضبوط گرفت نہیں جما سکے۔ مسئلہ جماعت اسلامی کا نہیں، پاکستانیت کا ہے۔ بنگلہ دیش کے ساتھ معاہدے ہوچکے ہیں۔ 1971ء کے واقعات کو دفن کردینے پر مفاہمت ہوچکی ہے۔ سقوط ڈھاکہ اب بیالیس برس پیچھے رہ گیا ہے۔ قومی اسمبلی کی قرار داد، ایوان کی رائے ہے، حکومت کا سفارتی ردِعمل نہیں۔ پیپلز پارٹی، ایم کیوایم اور اے این پی کی اپنی ترجیحات ہوں گی لیکن عبدالستار بچانی کی زہرافشانی افسوسناک

تھی۔کاش اس معاملے کوسیاست کی تنگ نظر عینک سے نہ دیکھا جاتا۔ جماعت اسلامی سے بغض کا یہ مطلب ہرگزنہیں کہ ایک درندگی پر پھول برسائے جائیں۔

اللہ اس شہید کو اپنے دامان رحمت میں جگہ دے۔ بلاشبہ وہ محض ایک فرد نہیں، ایک علامت ایک استعارہ تھا۔ مجیب الرحمٰن کی لہو نوش بیٹی کیا جانے کہ علامتیں لافانی ہوتی ہیں اوراستعارے مرانہیں کرتے۔

(روزنامہ نوائے وقت 19 دسمبر 2013)

☆☆☆